۵۰ نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد

Marfat.com

Marfat.com

۵۰

نامور ادبی شخصیات

ملک مقبول احمد

مقبول اکیڈمی
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	جنوری 2011ء
اشاعت دوم	جنوری 2012ء
اہتمام	ڈاکٹر ارشد مقبول
ناشر	مقبول اکیڈمی
مطبع	خورشید مقبول پریس
قیمت	چار سو روپے

MAQBOOL ACADEMY

Chowk Urdu Bazar, Circular Road, Lahore.
Ph:042-37324164, 37233165, Fax:042-37238241

10-Dayal Singh Mansion, The Mall, Lahore.
Ph:042-37357058, Fax:042-37238241
Email:maqbool@brain.net.pk

Marfat.com

علی سفیان آفاقی

کے نام

جو

"نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو"

کی مثال ہیں

Marfat.com

11095-5.

Marfat.com

فہرست

○ پیش لفظ	ملک مقبول احمد	11
○ حرفِ آغاز	علی سفیان آفاقی	13
○ عرض سدید	ڈاکٹر انور سدید	17
○ حرفِ شوق	سعید بدر	20
1- ابوالامتیاز، ع۔س۔ مسلم		31
2- احسان دانش		35
3- احمد پراچہ		40
4- ڈاکٹر اختر شمار		44
5- اسرار زیدی		47
6- اظہر جاوید		51
7- اعتبار ساجد		55
8- ڈاکٹر انور سدید		58
9- اے حمید		63
10- پروفیسر تنویر حسین		67
11- جبار مرزا		70
12- پروفیسر جمیل آذر		73

Marfat.com

13-	جمیل اطہر قاضی	78
14-	مولانا حامد علی خان	81
15-	حفیظ تائب	85
16-	حمیدا ختر	90
17-	حمید کاشمیری	94
18-	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	97
19-	قاضی ذوالفقار احمد	101
20-	رحمان مذنب	105
21-	ڈاکٹر رشید امجد	109
22-	پروفیسر رفیع اللہ شہاب	113
23-	رئیس احمد جعفری	116
24-	ستار طاہر	122
25-	سعید بدر	126
26-	ڈاکٹر سلیم اختر	131
27-	سید شبیر حسین شاہ زاہد	134
28-	صائمہ نورین بخاری	137
29-	ڈاکٹر صفدر محمود	139
30-	ڈاکٹر طارق عزیز	144
31-	عباس خان	148
32-	علامہ عبدالستار عاصم	152

Marfat.com

33-	عبدالعزیز خالد	156
34-	عذرا اصغر	161
35-	علی سفیان آفاقی	166
36-	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	171
37-	غلام الثقلین نقوی	173
38-	سید قاسم محمود	178
39-	نقش بند قمر نقوی بھوپالی	183
40-	مجیب الرحمٰن شامی	186
41-	محمد آصف بھلی	191
42-	محمد منشا یاد	194
43-	ڈاکٹر مسکین حجازی	198
44-	مقصود احمد چغتائی	202
45-	میرزا ادیب	205
46-	ناصر نقوی	211
47-	پروفیسر نذیر احمد تشنہ	214
48-	سید واجد رضوی	218
49-	ڈاکٹر وحید قریشی	221
50-	ڈاکٹر وزیر آغا	225

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' شائع ہوئی تو اسے غیر متوقع طور پر غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ پاکستان اور بیرون ملک سے تقریباً ایک سو دانشوروں نے اس کتاب پر بڑے خوبصورت اور مفصل تبصرے لکھے، جو ملک کے نامور رسائل اور اخبارات میں شائع ہوئے۔

کتاب پڑھ کر میرے دوستوں نے مجھے ادیب سمجھنا شروع کر دیا، حالانکہ میں واشگاف الفاظ میں اس کی تردید کر چکا ہوں، لیکن میرے کرم فرما میری اس بات کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں اور متعدد بار تقاضا کر چکے ہیں کہ ان ادیبوں کے خاکے لکھوں جن سے میں متعارف ہو چکا ہوں اور جن کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں، ان کرم فرماؤں میں جناب علی سفیان آفاقی، برادر عزیز پروفیسر جمیل آذر، جناب ڈاکٹر انور سدید اور محترم سعید بدر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دوستوں کے بار بار تقاضوں اور ان کے ارشاد کی تعمیل کے لئے میں نے یہ حل نکالا کہ اپنی کتاب پذیرائی میں اپنے تبصرہ نگاروں کو متعارف کرانے کے لئے میں نے جو سوانحی حالات ان سے حاصل کئے تھے، ان سے استفادہ کیا جائے اور ان کی فراہم کی ہوئی معلومات سے ہی یہ کتاب مرتب کی جائے۔ میں نے اس کاوش میں اپنا ذاتی تاثر شامل کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کے حسن ظن کی لاج کو پیش نظر رکھا ہے اور اب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' کے نام سے یہ کتاب پیش کر رہا ہوں۔

Marfat.com

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خیال رہے کہ یہ خاکے نہیں ہیں، شاید یہ شخصیت نگاری کے زمرے میں بھی نہیں آتے ہیں، میں نے چند مخلص دوستوں اور شخصیات کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں، میں اُوپر عرض کر چکا ہوں کہ یہ دراصل دوستوں کے وہ تعارف نامے ہیں جو انہوں نے میری "خودنوشت سفر جاری ہے" کے تبصرے کے ساتھ مجھے ارسال فرمائے تھے اور میں نے ان کا اختصار اپنے الفاظ میں اپنی کتاب "پذیرائی" میں ان کی تصویر کے ساتھ شامل کیا تھا۔

اس تعارف میں متعلقہ شخصیت کے متعلق اپنے تاثرات کے علاوہ جن معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، وہ معلومات میں نے مختلف ادبی رسائل، اخبارات کے ادبی صفحات اور چند خاص دوستوں سے حاصل کی ہیں، جن میں جناب ڈاکٹر طارق عزیز، جناب اظہر جاوید، محترم سعید بدر، پروفیسر تنویر حسین اور علامہ عبدالستار عاصم شامل ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل میں بہت سے دوستوں نے میرے ساتھ تعاون کیا اور میری رہنمائی فرمائی جس کے لئے میں ان سب کا بہت شکر گزار ہوں۔ خاص طور پر محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے مفید مشوروں سے نوازا، وہ نئے لکھنے والوں کی جس انداز میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں، وہ قابل تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

یہ کتاب اِنشاء اللہ حوالے کا کام دے گی اور ادب کے طالب علم اس سے یقیناً استفادہ کریں گے، کیونکہ اس میں بہت سے اہل قلم کے جملہ کوائف جمع کر دیئے گئے ہیں۔

ملک مقبول احمد

Marfat.com

حرفِ آغاز

میں حیران اور خوش نصیب ہوں کہ ملک مقبول احمد نے اپنی کتاب "۵۰ نامور ادبی شخصیات" کا حرفِ آغاز لکھنے کے لئے میرا انتخاب کیا، جسے میں عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ ملک مقبول احمد جب سے ادیب کے طور پر سامنے آئے ہیں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے نت نئے انداز اور نمونے سامنے آرہے ہیں۔ اس سلسلے کا آغاز ان کی "خودنوشت"، "سفر جاری ہے" کی اشاعت سے ہوا تھا جس میں ملک صاحب نے انتہائی سلیس بامحاورہ اور سادہ زبان لکھ کر سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اگر چہ ان کا اب بھی یہی اصرار ہے کہ وہ ادیب نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں ان کے اس بیان کی نفی کرتی ہیں۔ سادگی و پُرکاری ایک ایسی صنف ہے جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ آسان، رواں اور شُستہ زبان لکھنا کتنا مشکل کام ہے، یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو کوشش کے باوجود لفاظی اور شوکت الفاظ کا دامن نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ ایک فطری اور خداداد صلاحیت ہے جس سے ہر ادیب اور افسانہ نگار بہرہ ور نہیں ہوتا۔ اس میں قدیم روایت کا بھی دخل ہے۔ ایک زمانے میں برصغیر میں فارسی کا سکّہ چل رہا تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں بھی فارسی ہی سرکار اور شرفاء کی زبان تھی۔ مرزا غالب جیسے سخن ور اُردو کے مقابلے میں فارسی میں اشعار اور نثر لکھنے کو ترجیح دیتے تھے لیکن جب انہیں مشورہ دیا گیا کہ حضرت فارسی آپ کی مادری زبان نہیں ہے۔ لاکھ مہارت

Marfat.com

حاصل کرلیں فارس کے شعراء سے بہتر فارسی نہیں لکھ سکیں گے۔اس کے بعد غالب نے اُردو کو اپنایا۔آغاز میں ان کی غزلوں میں فارسی اصطلاحات، ترکیبوں اور بندشوں کی کثرت رہی لیکن جب ہم عصر بھی طعنہ زن ہوئے کہ ؎

کلامِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں اور خدا سمجھے

تو مرزا غالب نے بھی سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لیا اور پھر سادہ، آسان اور عام فہم زبان ریختہ کا استعمال شروع کر دیا۔ان سے پہلے مرزا محمد رفیع سودا کو بھی یہی مشورہ دیا گیا تھا جس پر انہوں نے عمل کیا۔ورنہ اُردو شاعری ایک عظیم شاعر سے محروم رہ جاتی۔

غالب کی ہر غزل گنجینۂ معنی کا طلسم ہے خواہ فارسی آمیز ہو یا سادہ اُردو۔ان کے تخیل کی پرواز اور ذہن کی رسائی اتنی دُور تک تھی کہ آج درجنوں تشریحی کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی اہلِ علم اور غالب کے مدّاح اصل حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔پھر غالب نے خطوط نویسی کا ایسا سادہ دلکش افسانوی انداز اپنایا کہ آج تک کوئی اس کی پیروی نہ کر سکا۔اسی حوالے سے نقاد بجا طور پر غالب کو اُردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔

اس طولانی تحریر سے مقصود یہ تھا کہ ملک مقبول احمد از راہِ انکسار خود کو ادیب نہیں کہتے لیکن ان کی تحریر میں جو شگفتگی، تازگی اور بے ساختہ پن ہے اس کی داد نہ دینا صریحاً ناانصافی ہوگی۔ اپنی تازہ ترین تصنیف میں انہوں نے اُردو کی پچاس نامور شخصیات کے خاکے پیش کئے ہیں۔ ملک صاحب نے ناشر کی حیثیت سے ساری زندگی گزاری ہے۔ادیبوں شاعروں کے وہ ناشر بھی رہے ہیں اور قریبی شناسا اور ملاقاتی بھی۔جن لوگوں سے انہیں واسطہ پڑا ہے۔انہوں نے ان کی قلمی تصویریں ایک ماہر عکّاس کی طرح پیش کر دی ہیں۔اس کے پیچھے ان کا مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ کارفرما ہے۔جن شخصیات کے بارے میں انہوں نے اپنے ذاتی تاثرات اور مشاہدات پیش کئے ہیں یہ وہ قلمی تصویریں ہیں جو انہوں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے سپردِ قلم کی ہیں۔ان نامور

Marfat.com

شخصیات کی طویل فہرست گنوانا لاحاصل ہوگا کیونکہ اگلے صفحات میں آپ خود ان آفتاب و ماہتاب کو جگمگاتا ہوا دیکھیں گے۔ یہ فہرست دراصل ان شخصیات پر مشتمل ہے جن سے وہ آشنا اور مانوس رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے بعد بھی مزید قلمی خاکے وہ ضرور سپردِ قلم کریں گے کہ اب انہیں قلم کے استعمال کی عادت پڑ چکی ہے۔ خاکہ نویسی کے بعد اب ملک مقبول احمد کس صنفِ ادب پر توجہ دیں گے اس کا جواب بہت جلد ہمارے اور آپ کے سامنے ہوگا چونکہ وہ ادیب بھی ہیں اور ناشر بھی۔ یعنی ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود ِگل کوزہ''۔ یہ سہولت اور ذہن رسا اور کتنے ناشرین کے حصے میں آیا ہے؟ ان سے ''مزید'' کی فرمائش کرنا بھی لازم نہیں ہے اس لئے کہ اب انہیں بھی لکھنے اور اپنی کتابیں خود چھاپ کر پڑھنے کی عادت پڑ چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت، زندگی اور حوصلہ عطا فرمائیں تا کہ وہ اپنے ''اس دو دھاری'' قلمی جہاد کو جاری رکھ سکیں۔ کوئی بعید نہیں، اگر آئندہ آپ ان کے شعری مجموعے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ملک صاحب کی نثر اب واقعی اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس قدر سلیس اور شُستہ انداز میں یہ خاکے لکھے گئے ہیں کہ انہیں ادب پارے کہا جا سکتا ہے۔ انہیں زبان پر اب اتنا ہی عبور حاصل ہو چکا ہے جتنا کہ بطور ناشر کتابوں کی نشر و اشاعت پر حاصل تھا۔ ملک مقبول صاحب کی طبیعت میں انکسار بہت زیادہ ہے، یہ ایک بہت بڑی انسانی خوبی ہے لیکن براہِ کرم اب وہ اپنے بارے میں کہنا اور لکھنا ترک کر دیں کہ انہیں لکھنا نہیں آتا۔ وہ ایک خود ساز ادیب ہیں، انکسار اپنی جگہ، لیکن حقیقت سے انکار بھی خلافِ انصاف ہے۔

علی سفیان آفاقی

Marfat.com

Marfat.com

عرضِ سدید

میں تو اسے ملک مقبول احمد کے پوتے پوتیوں اور نواسیوں کی ذہانت کا کرشمہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اصرار کر کے اپنے دادا جان سے اُن کی زندگی کی کہانی سنی اور پھر اسے کاغذ پر اُتروانے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ بیرونی اصرار پر اپنی خودنوشت سوانح عمری لکھنا نئی بات نہیں۔ بیشتر مصنفین نے اپنے دوستوں کی خارجی تحریک پر ہی اپنی آپ بیتیاں لکھی ہیں، لیکن ان کا اثاث الادب یہ ایک کتاب ہی ہے۔ جس کے لکھنے کے بعد ''محترم آپ بیتی نگار'' پھر گردشِ وقت کی نذر ہو گئے..... ملک مقبول احمد کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ''سفر جاری ہے'' اپنے ادارے مقبول اکیڈمی کے مصنفین کے سامنے پیش کی تو ان ادیبوں نے ان کے باطن سے ایک قلم کار دریافت کرلیا اور پھر انہیں میدانِ تالیف و تصنیف کی طرف بھی لے آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج ملک مقبول احمد ایک ایسے ادیب نظر آتے ہیں جن کی تعریف و توصیف کرنے والے پوری اُردو دُنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی کتابوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

انہوں نے محترم علی سفیان آفاقی، جناب اظہر جاوید، جناب پروفیسر جمیل آذر، محترم سعید بدر، جناب ڈاکٹر طارق عزیز اور ڈاکٹر تنویر حسین کا شکریہ ادا کیا ہے کہ یہ ادبائے

Marfat.com

کرام ''سفر جاری ہے'' کی تحسین میں پیش پیش تھے، لیکن ان کی ''کتابِ زیست'' کے اسلوب پر زبان و بیان اور طرزِ تحریر پر ادبی رنگ غالب آجانے کی پہلی تحسین جناب ڈاکٹر صفدر محمود نے کی، جن کی رائے سندِ افتخار کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کی تعریف کی اور ''سفر جاری ہے'' کو سوانح عمریوں میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ ملک صاحب نے اس کتاب میں اپنے ادارے کے مصنفین کو بھی متعارف کرایا اور ان کا تذکرہ روشن الفاظ میں کرنے کے علاوہ، چند نامور ادیبوں کے خطوط اور کتابوں پر تبصرے بھی شائع کئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب شخصی سوانح عمری نہیں رہی، بلکہ اب یہ ایک معروف اشاعتی ادارے کی تعمیر و تشکیل اور فروغ وارتقاء کی تاریخ بھی بن گئی ہے۔

عام لوگ صرف اپنی ناک کے نیچے دیکھنے کے عادی ہیں، انہیں اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور وہ اپنے بہترین دوستوں کا تذکرہ کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں، لیکن ملک مقبول احمد نے پہلے اپنی ''کم علمی'' کا اعتراف کیا اور پھر ''صحبتِ ہم نشین'' پر فخر کا اظہار کیا۔ آخری بات کا احساس ہوتے ہی ان کو خیال آیا کہ جن ادیبوں نے ان کے ادارے کو اپنی اعلیٰ پائے کی کتابوں سے معیار، اعزاز اور وقار عطا کیا ہے، ان کا ذکر الگ ہونا چاہئے۔ بلاشبہ یہ جوہر تو ان کی سابقہ کتابوں میں بھی موجود تھا لیکن اب انہوں نے اپنی ذات کو ''مرکزِ کائنات'' بنانے کی بجائے ہمیں ''حدیثِ دیگراں'' سنائی ہے۔ زیرِ نظر کتاب ان کی شخصیت نگاری کا ایک خوبصورت نقش ہے۔ جس کی فنی ٹیکنیک انہوں نے خود وضع کی ہے۔ بظاہر اس کتاب میں کاروباری تعلق کی جھلک بھی موجود ہے لیکن اس میں مصنفین کے حالاتِ حیات کا قیمتی اجمال بھی سما گیا ہے جو طلباء کے لئے ان کے تحقیقی کاموں میں معاون ثابت ہوگا اور ادیبوں کی شخصیت کے بارے میں ملک صاحب کے ذاتی تاثر نے کردار نگاری کی صورت بھی اختیار کی ہے۔ اس کتاب کا ہر ادیب اپنی ذات میں

Marfat.com

ایک کائنات ہے۔اس کائنات کا مشاہدہ ملک مقبول احمد نے اپنے انداز میں کیا تو ان کے اوصافِ خفتہ ان پر روشن ہوتے چلے گئے اور پھر آئینہ دل سے انعکاس ہونے لگا تو ملک صاحب نے اپنے تاثر کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اس کتاب میں محفوظ کر دیا۔ میں اس کتاب کی تالیف پر ملک مقبول احمد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بلاشبہ وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنی عمر کی پختگی کے دور میں آئے ہیں لیکن کئی خرگوشوں سے آگے نکل گئے ہیں، ان کی کتابوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے۔

انور سدید

۲۰ دسمبر ۲۰۱۰ء لاہور

Marfat.com

حرفِ شوق

ملک مقبول احمد کی اصل شہرت تو ایک کامیاب ناشر، ایک ملنسار اور مرنجان مرنج انسان کی حیثیت سے ہے، لیکن جب ان کی خودنوشت سرگزشت، ''سفر جاری ہے'' سامنے آئی تو وہ چشم زدن میں کامیاب اور مقبول ترین ادیبوں اور سوانح نگاروں کی صف میں نمایاں طور پر کھڑے نظر آئے۔

انگریزی زبان کا مقولہ ہے:

"He came, he saw and he captured".

''وہ آیا، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا''۔

اس کے فوراً بعد ''پذیرائی'' اور پھر ''اہلِ قلم کے خطوط'' کے عنوان سے دو مزید کتابیں منصہ شہود پر آئیں تو اُن لوگوں کے شکوک ''دُور'' ہو گئے جو ورطۂ حیرت میں ڈوبے ہوئے اور عالم استعجاب میں غرق تھے اور ابھی تک فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ملک صاحب واقعی ادیب، سوانح نگار اور سفرنامہ نگار بھی ہیں، کیونکہ یہ تمام اوصاف ان کی کتاب اوّل ''سفرنامہ جاری ہے'' میں موجود تھے، اس کے بعد آنے والی کتاب ''پذیرائی'' میں اکثر و بیشتر ادیبوں، دانشوروں اور قلمکاروں نے ان اوصاف کا نہ صرف اعتراف کیا ہے بلکہ اس سلسلے میں ملک صاحب کو خوب داد دی ہے۔

علم و ادب اور دانش و حکمت سے وابستہ بیشتر اصحاب و حضرات، ملک صاحب کی بحیثیت ایک ادیب و قلمکار کے سامنے آنے پر ایک طرف اُن کی تعریف و توصیف میں قلم و بیان ہر

Marfat.com

دوطریقوں سے رطب اللسان ہیں، دوسری طرف وہ اب تک حیرت واستعجاب کے عالم میں ڈوبے ہوئے ہیں، کیونکہ ملک صاحب نے ''پذیرائی'' اور ''اہل قلم کے خطوط'' کی اشاعت کے ساتھ ''حیرت واستعجاب'' کو نہایت کامیابی اور ہوشیاری کے ساتھ قائم و برقرار رکھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انتہائی قلیل مدت میں درج بالا تین کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کی تین اور کتابیں اُفق عالم پر ''طلوع'' ہوئی ہیں، جن میں نہایت دلکش ٹائٹل لئے ہوئے ''ارمغانِ غزل''، ''گلشنِ ادب'' اور ''گمشدہ افسانے'' شامل ہیں۔ یہ دونوں دلچسپ، دلکش اور معلومات افزا کتب سال ۲۰۱۰ء کا بہترین علمی اور ادبی تحفہ ہیں۔ دراصل یہ ہر سہ کتب، ملک صاحب کے اس دور کی یاد دلاتی ہیں، جب ''آتش جوان'' تھا اور انہوں نے ''چودھویں صدی'' کے نام سے تین چار سال تک ایک عمدہ رسالہ نکالنے کا تجربہ کیا تھا، ان میں سے ایک کتاب ''چودھویں صدی'' میں چھپنے والی غزلوں کے انتخاب پر مشتمل ہے اور دوسری میں علمی و ادبی مضامین کے انتخاب پر مبنی ہے۔ جبکہ تیسری منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے، ان تینوں کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد جہاں اہلِ علم و ادب کو بے پایاں مسرت اور بے حدوحساب خوشی اور طمانیت ملے گی، وہاں ان کے حیرت واستعجاب کا عالم بدستور برقرار رہے گا۔

درج بالا دعویٰ کرنے میں میرے پاس معقول دلیل اور ٹھوس ثبوت موجود ہیں اور وہ ہے ملک مقبول احمد صاحب کی نئی کتاب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات''، ملک صاحب نے مجھ ایسے حقیر وناچیز کو اس کتاب کا ''دیباچہ'' لکھنے کا ''حکم'' صادر فرمایا ہے۔ کئی دنوں سے حیران و پریشان ہوں کہ آخر ملک صاحب کو یہ خیال کیوں سوجھا ہے کہ میں اُن جیسے بلند پایہ عالم و فاضل کی کتاب کا دیباچہ لکھوں، جن کی حیثیت چار دانگ عالم میں مسلمہ ہے، حالانکہ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ ؎

من نہ ملا، نے فقیہہ نکتہ ور
نَے مرا از فقر و درویشی خبر
در رہ دیں تیز بین و سست گام
پختہ من خام و کارم ناتمام

Marfat.com

یعنی ''نہ میں ملا ہوں (جس کا علم وفضل سے کوئی تعلق ہو) نہ میں فقہ وشریعت کا ماہر ہوں یا نکتہ داں فلسفی ہوں، دین کے راستہ میں، میں ''تیز بیں'' ضرور ہوں، لیکن عمل کے اعتبار سے سست رو ہوں (یاد رہے کہ علامہ تو تیز بیں تھے لیکن مرد حقیر تو ہرگز ہرگز تیز بینی کا دعویدار نہیں، بلکہ جاہل مطلق ہونے کا ضرور معترف ہے) میرا پختہ کام بھی ناپختہ وخام اور نامکمل ہے''۔

اس لئے میرے خیال میں ملک صاحب نے ''ناچیز'' کا انتخاب کر کے درست فیصلہ نہیں کیا، یاد آیا وطن عزیز میں ایک قابل قدر اور قابل صد احترام قانون دان تھے، جو جنرل ایوب خاں کے آمرانہ دور میں پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر بھی سرفراز ہوئے۔ وہ ڈکٹیٹر شپ میں حکومت پر ''تنقید'' اور اپنی حق گوئی اور بیباکی کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے، اہل فکر ونظر انہیں ایم آر کیانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک وکیل شاعر جناب اثر صہبائی نے اپنے نعتیہ کلام پر مبنی کتاب کا دیباچہ لکھنے کے لئے انہیں درخواست کی اور کتاب کیانی صاحب کے ہاں چھوڑ آئے۔ کیانی صاحب لکھتے ہیں کہ ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ صہبائی صاحب نے کتاب کا دیباچہ لکھنے کے لئے آخر مجھے ہی کیوں منتخب کیا ہے؟ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ میرا ''شعر وادب'' سے کوئی تعلق نہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''اس کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ میں نے لاہور ہائی کورٹ میں چیف جسٹس ایس اے رحمٰن کی جگہ لی ہے اور چونکہ وہ ادیب اور شاعر تھے، اس لئے انہوں نے سمجھ لیا کہ میں بھی ضرور ادیب وشاعر ہوں گا، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ رہی دوسری وجہ تو وہ مجھے بھول گئی، البتہ تیسری وجہ یہ ہے کہ میرے آبائی ضلع کوہاٹ میں پشتو زبان کے بلند پایہ شاعر خوشحال خاں خٹک ہوگزرے ہیں، شاید اس لئے انہوں نے سمجھا کہ ان کے حوالے سے میں بھی شاعر ہوں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ خوش حال خاں خٹک کا گاؤں میرے گاؤں سے 5 میل دُور ہے اور درمیان میں ایک بہت بڑا دشوار گزار آبی نالہ بھی ہے جو دونوں دیہات کے درمیان حد فاصل ہے، اس لئے ان کی جانب سے مجھے ادیب وشاعر تصور کرنا کسی طرح بھی درست نہیں''.....

آخر میں لکھتے ہیں کہ مجھے دوسری وجہ بھی یاد آ گئی اور وہ یہ ہے کہ اثر صہبائی صاحب کو خیال

11095

Marfat.com

آیا ہوگا کہ وہ خود اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نعت نگار ہیں اور ان کی کتاب کا دیباچہ لکھ کر میں بھی ادیبوں، شاعروں اور بالخصوص مدحت رسول مقبول ﷺ کرنے والوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤں گا''۔

اس تحریر کے راقم کا بھی یہی خیال ہے کہ ملک صاحب نے سوچا ہوگا کہ یکے بعد دیگرے پانچ، چھ عمدہ اور دل آویز کتابیں پیش کر کے وہ ''ادیب شہیر'' تسلیم کئے جا چکے ہیں اور اگر ان کی کسی کتاب عالیہ پر سعید بدر جیسا حقیر و پُر تقصیر انسان جو ادیب ہے اور نہ شاعر، بلکہ کسی بھی زمرے میں نہیں آتا، پیش لفظ لکھے گا تو وہ بھی ادیبوں یا شاعروں کے زمرے میں شمار ہونے لگے گا، حالانکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ادیب و شاعر بننے کے لئے برسوں کا طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ جگر خون کرنا پڑتا ہے، کسی اعلیٰ پائے کے ادیب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں ربِ عظیم و کریم کی ''عطائے خاص'' کا ہونا لازمی ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا اس سلسلے میں ارشاد ہے کہ:ے

رنگ و ہو خشت و سنگ، چنگ ہو یا صرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

قطرۂ خون جگر دل کو بناتا ہے سِل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

تاہم اپنی تمام تر عاجز و انکساری کے باوجود زیر نظر کتاب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' پر چند سطور لکھنے پر مجبور ہوں، کیونکہ ملک مقبول صاحب کا حکم ہے جسے کسی طور ٹالا نہیں جا سکتا تھا، ملک صاحب اپنی ذات اور قوم کے اعتبار سے اعوان ہیں اور مرحوم انور بیگ اعوان کی تحقیق کے مطابق اعوان عربی النسل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کی اولاد میں سے ہیں، جن کی تکریم ہم پر لازمی ہے۔

Marfat.com

زیرِنظر کتاب میں جتنی بھی شخصیات شامل ہیں، ان سب سے ملک صاحب کا کسی نہ کسی طرح سے تعلق رہا ہے۔ اکثر و بیشتر وہ شخصیات ہیں جن کا تعلق ''کتاب'' سے ہے یا کبھی رہا ہے۔ اگر ان کو ''اہلِ کتاب'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان حضرات میں تین اقسام کے لوگ شامل ہیں، پہلی قسم ان حضرات کی ہے جن کی تلاش میں ملک صاحب نے خود سرگردانی کی، کیونکہ یہ ان کے پیشے کا تقاضا تھا اور کاروباری ضرورت تھی۔ دوسرے وہ لوگ جو براہِ راست ملک صاحب سے ملے اور پھر اُن سے ''کتاب'' کا تعلق قائم ہو گیا۔ تیسرے وہ اصحاب ہیں جنہیں ملک صاحب کے احباب نے متعارف کرایا اور بالآخر یہ تعارف کتاب کے رشتے پر منتج ہوا۔

پہلی قسم کے حضرات کے بارے میں ملک صاحب خود رقم طراز ہیں کہ ''میں اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی معمولی تعلیم کے باوجود، ''چودھویں صدی'' کی اشاعت نے مجھے خود اعتمادی عطا کی اور اس کے بعد میں نے نشر و اشاعت کے میدان میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ میں چاہتا تھا کہ شروع میں مجھے چند ایسی کتابیں چھاپنے کے لئے مل جائیں جنہیں اس دور کے پڑھنے والے پسند کریں اور کتاب خرید کر پڑھیں۔ محترم احسان دانش اور چند دیگر دوستوں نے اس دور کے مقبول ترین مصنف رئیس احمد جعفری سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ جعفری صاحب ان دنوں میکلوڈ روڈ کی بغل میں ٹیگور پارک میں رہتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسمی بات چیت کے بعد میں نے مدعا بیان کیا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی، بلکہ حوصلہ افزائی کی اور چند ملاقاتوں کے بعد انہوں نے مجھے ایک نہیں دو ناولوں کے مسودے عنایت کر دیئے۔ رئیس احمد جعفری کی شفقت نے میرے ادارہ مقبول اکیڈمی کو ابتداء میں ہی مضبوط بنیاد فراہم کی۔ میں اسے ان کا احسانِ عظیم سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' کا ترجمہ کیا تو اس کی اشاعت کا اعزاز مقبول اکیڈمی کو عنایت فرمایا اور ایک ماہ میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اشاعتی دُنیا میں یہ پہلی کتاب تھی جس کے آرڈر ہمیں پورے ملک سے ٹیلی گراموں کے ذریعے موصول ہوتے رہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جعفری صاحب نے اس میں مولانا ابوالکلام کی ان باتوں کا مدلل جواب دے دیا تھا جو انہوں نے

Marfat.com

پاکستان کے خلاف لکھی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس کتاب پر جن بڑی شخصیات نے مجھے تعریفی خطوط لکھے، ان میں چودھری محمد علی (سابق وزیراعظم پاکستان)، مشتاق احمد گورمانی، میاں ممتاز دولتانہ، خان عبدالقیوم خان، مولانا حامد علی خاں، جناب ہاشم رضا اور قدرت اللہ شہاب شامل تھے"۔

پیش نظر کتاب کی ورق گردانی کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ملک صاحب کا اندازِ تحریر بہت دلکش اور دلچسپ ہونے کے ساتھ بہت سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ "ملک صاحب سب کے دوست ہیں اور سب ان کے دوست ہیں"، ان کے دل میں سب حضرات کے لئے ایک خاص جگہ ہے اور دل میں احترام موجود ہے اور یہ احترام، یہ تعلق خاطر، بظاہر کاروباری ہونے کے باوجود بے لوثی اور بے غرضی پر مبنی نظر آتا ہے۔ پوری کتاب میں انہوں نے کسی قلمکار کے خلاف ایک جملہ تو کجا، ایک حرف تک نہیں لکھا۔ یوں لگتا ہے کہ سبھی کے سبھی نیک، پارسا اور دوست نواز لوگ ہیں اور سبھی انسانیت کے عالمگیر رشتہ سے منسلک ہیں۔ ملک صاحب سب کو ہی دوست یا بھائی گردانتے ہیں۔ وہ پرانی اقدار پر عامل ہیں اور بڑوں کا احترام کرتے ہیں بلکہ ان کے سامنے پہنچ کر سراپا ادب ہو جاتے ہیں لیکن چھوٹوں سے بھی یوں پیش آتے ہیں کہ لگتا ہے کہ وہ مقام و مرتبہ میں بلند تر ہیں اور ان کے مقابلے میں ملک صاحب منکسر المزاج دکھائی دیتے ہیں۔ راقم نے یہ وصف گرانقدر ماہنامہ "ہمایوں" کے مدیر اور ممتاز ادیب و شاعر میاں بشیر احمد میں دیکھا۔ مشہور محقق، ادیب اور ماہر تعلیم مرزا منور نے بھی ان کے اس وصف کی تصدیق کی اور شہادت دی۔ پوری کتاب میں اندازِ تحریر ایسا ہے کہ ہر قلمکار کی شخصیت نکھر کر، سنور کر اور اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کے باوجود قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہوں نے مبالغہ آمیزی یا سخن آرائی سے کام لیا ہو، وہ جو کچھ لکھتے ہیں وہ حقیقت اور صداقت (Reality) پر مبنی نظر آتا ہے۔ مجال ہے کہ کسی کی دل آزاری کی گئی ہو یا کہیں ذم کا پہلو سامنے آیا ہو۔ ملک صاحب حافظ شیرازی کے مسلک پر کاربند نظر آتے ہیں جنہوں نے فرمایا تھا۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

بادوستاں مروت، بادشمناں مدارا

Marfat.com

ملک صاحب چاہتے تو زیرِ نظر کتاب میں ان قابلِ احترام شخصیات کے حوالے سے بعض سچے اور حقیقی واقعات (اور یہ ممکن ہی نہیں کہ پچاس سالہ زندگی میں انہیں ایسے سچے واقعات پیش نہ آئے ہوں) کا اندراج کر سکتے تھے جن سے ان کی اپنی خودستائی، خودنمائی اور بڑائی اُبھر کر سامنے آتی، لیکن اس ضمن میں انہوں نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا ہے اور کہیں بھی اپنی ذاتی تعریف و توصیف یا بڑائی کا شائبہ تک نہیں ہونے دیا، حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جب کسی مصنف یا قلمکار کی کتاب چھپ کر سامنے آتی ہوگی تو لامحالہ وہ قلمکار ملک صاحب کی تعریف و تحسین کرتا ہوگا، لیکن مجال ہے کہ ملک صاحب نے کہیں بھی ایسے کسی واقعہ کا ذکر کیا ہو۔ ماسوائے ایک دو جگہ ان الفاظ کے کہ مصنف نے عالم سرخوشی میں اُٹھ کر ملک صاحب سے معانقہ کیا۔ بہرحال ہر معاملے میں ملک صاحب کا رہوارِ قلم بہت محتاط ہے۔ وہ کہیں بھی اپنے **راستہ** یعنی صراطِ مستقیم سے تجاوز نہیں کرتا۔

لطف کی یہ بات ہے کہ اس کتاب میں مندرج جن شخصیات کا ذکرِ خیر آیا ہے، وہ اپنا اپنا ذکر پڑھ کر یہی سمجھیں گے کہ ''ملک صاحب **عرف** اور صرف اس کے دوست ہیں، حالانکہ ملک صاحب سب کے دوست ہیں اور سب کے بھائی اور سب کے یارِ خاص ہیں''۔

ادیبوں، شاعروں اور قلمکاروں کی تلاش و جستجو میں ملک صاحب نے جان جوکھوں سے کام لیا ہے، انہیں جہاں کسی ادیب کی بھنک پڑی وہاں فوراً پہنچے اور پھر اندازِ گفتگو ایسا کہ ہر کسی سے کتاب کا مسودہ لے کر ہی واپس لوٹے۔ حتیٰ کہ بعض حضرات کی تلاش میں میانوالی، راولپنڈی اور کراچی تک جا پہنچے۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں سے ناکام یا مایوس واپس نہیں لوٹے۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مقبول اکیڈمی ایک پُرکشش، باوقار اور قابل اعتبار ادارہ بن گیا اور لوگ خود خواہش کرنے لگے کہ ان کی کتاب ملک مقبول صاحب کے ادارے میں چھپے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات کے سربراہ مسکین علی حجازی اپنی پہلی کتاب کا مسودہ لے کر بہ نفسِ نفیس ان کے پاس آئے، ملک صاحب لکھتے ہیں:

Marfat.com

''میں نے مقبول اکیڈمی میں ان کی پذیرائی ان کے شایانِ شان کی اور حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہوئے کہا''۔

''کاش! مقبول اکیڈمی کو آپ کی پہلی کتاب شائع کرنے کا شرف حاصل ہو جائے''۔ مسکین حجازی بولے، ''ملک صاحب! آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں آج آپ سے یہ دریافت کرنے آیا تھا کہ آیا آپ میری پہلی کتاب قبول کرلیں گے''۔ میرے سوال پر ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھی تھیں اور مسودہ ان کے بیگ میں تھا، نکالا اور مجھے دے دیا۔ میں نے فوراً کاتب کو بلا کر کتابت کے لئے اُسے دے دیا''۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ع

دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی

یہ حیران کن اور خوش کن امر ہے کہ ملک صاحب کے حلقۂ احباب میں دین و مذہب سے دلچسپی اور رغبت رکھنے والے حضرات بھی شامل ہیں اور سوشلسٹ اور کیمونسٹ بھی دندناتے نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو جبہ و دستار کے حامل ہیں اور سرکاری عہدوں پر فائز حضرات بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے دکھائی دیتے ہیں، وہ ان سب میں برابر مقبول اور پسندیدہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی نے کہا تھا۔

نہیں کرتا کسی برتن سے کھٹ پٹ
ہر اک سانچے میں ڈھل جاتا جھٹ پٹ

سو ملک صاحب کا بھی یہی عالم ہے، ان کے اخلاق، ان کے اطوار اور ان کے کردار کے سب گرویدہ ہیں۔ وہ لوگوں سے بآسانی گھل مل جاتے ہیں اور ہر ملنے والے کو آن واحد میں اپنا بنا لیتے ہیں، کسی سے کھٹ پٹ نہیں کرتے، کسی سے لڑتے جھگڑتے نہیں، کوئی ناگوار بات کہہ دے تو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے ہیں اور یہ خوبیاں اللہ والوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بھی حیرانی ہوتی ہے کہ ایک شخص جو آج سے ساٹھ سال قبل اپنے گاؤں ''دیووال'' (ضلع سیالکوٹ) سے اپنی منزل کی تلاش میں چلا تھا، لاہور پہنچا اور آہستہ آہستہ اس نے اپنے گرد شائقین کا ہجوم جمع کرلیا۔ یہ

Marfat.com

عام لوگوں کا ہجوم نہیں تھا، بلکہ چیدہ چیدہ حضرات کا اجتماع خاص تھا، جس میں معاشرے کے بہترین اور چیدہ چیدہ لوگ شامل ہیں جو نہ صرف اپنے معاشرہ بلکہ اپنی قوم وملت حتیٰ کہ پوری انسانیت کی رہنمائی کرتے ہیں۔ کسی نے کہا تھا۔

وہ اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
اور لوگ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

ہم دیکھتے ہیں کہ زیرِ نظر کتاب میں یہ قافلہ ۱۵۰ افراد پر مشتمل ہے، جبکہ ''پذیرائی'' میں ۹۰ سے زیادہ حضرات اس میں شامل ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہیں ایک دُنیا سلام پیش کرتی ہے، ان کے سامنے ادب سے سر جھکاتی ہے اور ان کو ایک نظر دیکھنا کارِ ثواب سمجھتی ہے۔ مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومیؒ نے کہا تھا کہ۔

دیدنِ دانا عبادت ایں بود
فتح ابواب سعادت ایں بود

یعنی ''مرد دانا کا دیکھنا عبادت کے مترادف ہے، کیونکہ اس سے برکت اور سعادت کے دروازے کھل جاتے ہیں''۔ حقیقت ہے کہ ملک صاحب نے اپنے گردوپیش میں ''خوشبودار'' لوگوں کا حسین وجمیل مرقع جمع کرلیا ہے اور وہ رنگارنگ پھولوں کی خوشبو سے نہ صرف سرشار ہیں بلکہ ان سے متمتع اور مستفید بھی ہورہے ہیں اور اب دوسروں کو بھی فیض یاب کرنے کا بیڑا اُٹھالیا ہے۔

ملک مقبول احمد کو اگر میں ''صوفی بزرگ'' یا ''ولی اللہ'' کہوں تو بیجا نہ ہوگا، کیونکہ ''ولی اللہ'' اور صوفی میں جو خوبیاں اور اوصاف ہوتے ہیں وہ ملک صاحب میں بہت حد تک موجود ہیں۔ صوفی اور ولی اللہ دونوں اپنے اپنے طور پر بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہیں، ان کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ ہر انسان سے محبت اور دوستی کرتے ہیں، کسی کی دل آزاری نہیں کرتے، بلکہ کوئی گالی بھی دے، کوئی پتھر بھی مارے، تو اُسے صرف دُعا دیتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر شخص کے اندر اور اس کے باطن میں موجود اچھائیوں، خوبیوں اور محاسن کو اُجاگر کیا جائے، اس کا تزکیۂ نفس ہوجائے اور وہ بنی نوع انسان کے کام آئے۔ وہ سب کے

Marfat.com

ہمدرد، سب کے دوست اور سب کے رفیق اور مونس وغم خوار ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کی خدمت کے وسیلے سے وہ اللہ تعالیٰ کے دوست بن جاتے ہیں۔

یہ بات میں نہیں کہتا، آپ خود ہی اندازہ فرمایئے! کیا یہ تمام خوبیاں اور محاسن ملک صاحب کی ذات میں موجود نہیں؟ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔

ہمارے معاشرے میں بالعموم یہ مشہور ہے کہ ہر پبلشر اور ناشر بہت سنگدل اور ظالم ہوتا ہے۔ وہ شریف النفس ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے مسودے لے کر انہیں بار بار ''پھیرے'' لگواتا ہے۔ برسوں تک کتاب نہیں چھاپتا اور اگر چھاپتا ہے تو معقول معاوضہ نہیں دیتا، لیکن ملک صاحب ان تمام ناشروں سے بالکل مختلف ہیں، انہوں نے جس کسی کی کتاب چھاپی، اُسے مناسب معاوضہ ضرور دیا۔ یہ اُن کا ریکارڈ ہے۔ اس کی گواہی میں نہیں دیتا بلکہ ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی صاحبزادی محترمہ سلمیٰ صدیقی کی شہادت پیشِ خدمت ہے، وہ رقمطراز ہیں۔

''میرے خیال کے مطابق پبلشر وہ شخص تھا جو مصنف کا خون چوس کر اپنے لئے آرام مہیا کرتا ہے اور ادیب کو جائز معاوضہ دینے کے لئے ہزار چکر لگوا کر خوار کرتا ہے، اس تصور میں ''دراڑ'' پہلے ہی پڑ چکی تھی۔

لیکن ''سفر جاری ہے'' پڑھ کر پہلی بار احساس ہوا کہ اس سفر کے دوران جو مقبول صاحب نے کیا، اس طرح کے مقامات آتے ہیں، یہ مقبول صاحب کی وسعتِ قلب ونظر ہے کہ وہ ان مقامات کے ذکر کے دوران مثبت پہلو نمایاں رکھتے ہیں۔ نتیجتاً پڑھنے والا ان کے ساتھ کامیابیوں کی مسرت میں Share کرتا ہے، لیکن مصائب کی اذیت کا ادراک نہیں کرتا۔ مصائب ان کے ہاں تجربات کی صورت اختیار کر جاتے ہیں، البتہ اگر ذرا توقف کر کے Imagination کو رختِ پرواز دی جائے تو سانس کہیں رُکتی نہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ مصنف خود ہی قاری کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھنے پر مصر ہے''۔

Marfat.com

آخر میں، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زیرِ نظر کتاب میں ادبی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بالکل ''نیا اسلوب'' اور ''انوکھا طرزِ تحریر'' اختیار کیا ہے، اس کا تعلق نہ ''شخصیت نگاری'' سے اور نہ خاکہ نگاری سے ہے۔ یہ دونوں کے ''بین بین'' اسلوب ہے یا پھر اسے خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کا حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے۔ ملک صاحب نے اپنے ''پیش لفظ'' خود اعتراف کیا ہے کہ:

''..... یہ خاکے نہیں شاید یہ شخصیت نگاری کے زمرے میں بھی نہیں آتے'' تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیا ہیں؟ انہیں کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ آیئے! اس مسئلے کو اہل علم و ادب اور اہل نقد و نظر پر چھوڑ دیں کہ وہ انہیں کیا نام دیتے ہیں اور کس زمرے میں شمار کرتے ہیں؟

بہر حال یہ امر طے ہے کہ یہ کتاب حوالے اور ریفرنس کا کام دے گی اور ادب کے طلباء اس سے مستفید ہوں گے۔ ملک صاحب نے نہایت عرق ریزی، محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ ۵۰ کے قریب ادباء و شعراء اور اہل قلم کے بارے میں نہ صرف مستند معلومات جمع کر دی ہیں بلکہ ان جلیل القدر شخصیات کا دلکش اور دل آویز مرقع پیش کر دیا ہے جسے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ مزید برآں تصاویر سے کتاب کو مزین کیا گیا ہے، جس سے اس کی دلکشی، زیبائی، افادیت اور اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

واضح رہے کہ یہ کتاب ملک صاحب کی آخری کتاب نہیں بلکہ اس کے بعد بھی وہ مزید ''دھماکے'' کرنے والے ہیں۔ شنید ہے کہ ''ترکی کا سفرنامہ'' اور ''شناسائی'' کے عنوان سے دو مزید کتابیں بھی زیرِ طباعت ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ:

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

''البدر''.....۹۶۵۔ نظام بلاک
علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
۰۴۲۔۳۵۴۱۴۵۹۰
۰۳۲۱۔۴۸۷۲۷۰۰

محمد سعید احمد بدر قادری
المعروف بہ
سعید بدر
۲۵ دسمبر ۲۰۱۰ء

Marfat.com

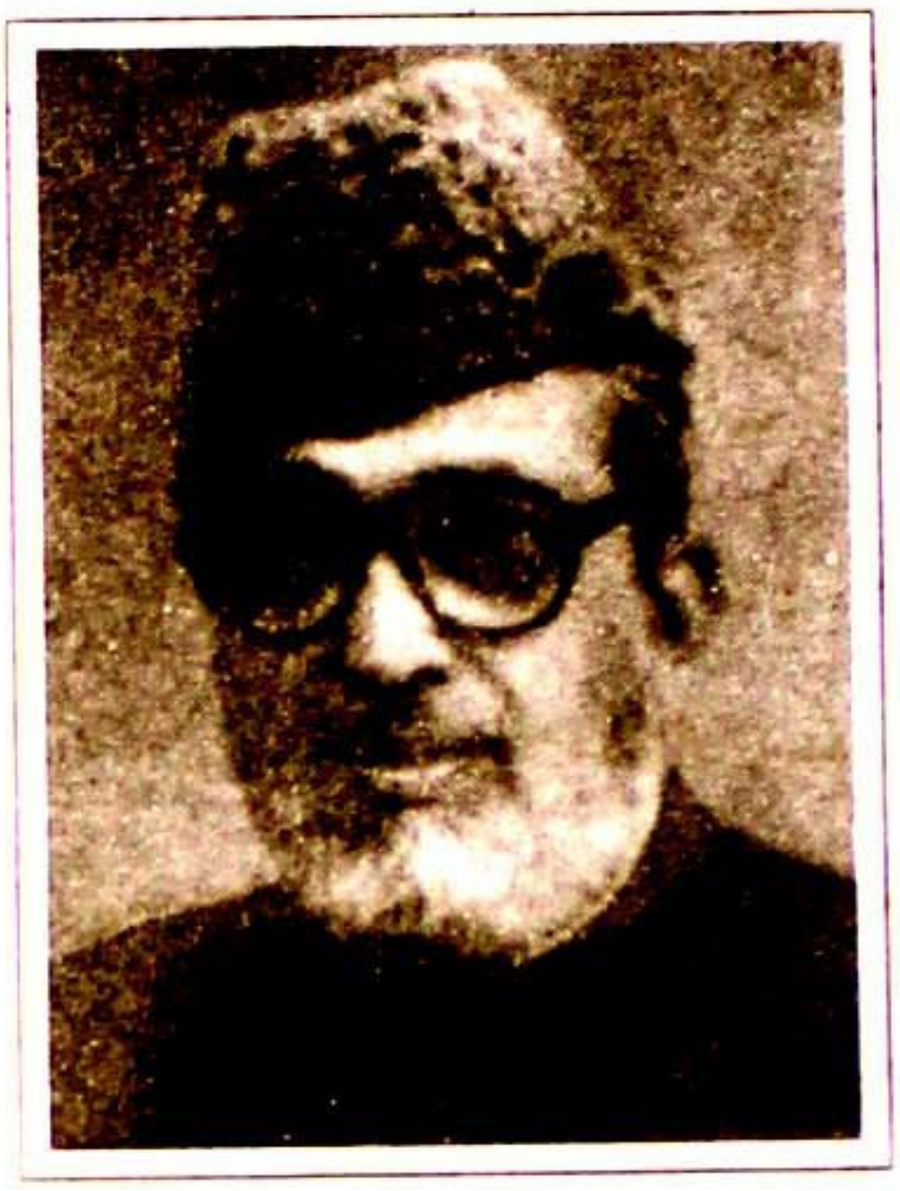

ابوالامتیاز، ع۔س۔ مسلم

ابوالامتیاز، ع۔س۔ مسلم کا پورا نام عبدالستار مسلم ہے، ان کی پہلی حیثیت ایک ادبی صحافی کی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انہوں نے ''نیا راہی'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ کراچی سے جاری کیا تھا، جس میں اس دور کے تمام بڑے ادیبوں کی تخلیقات چھپتی تھیں اور اس پرچے کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن پھر اس کا حشر بھی وہی ہوا جو میرے رسالہ ''چودھویں صدی'' کا ہوا تھا، یعنی ادب کے عام قارئین نے سرپرستی نہ کی، رسالہ فروشوں نے قیمت ادا نہ کی اور مفت رسالہ پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔ اس اشاعتی ادارے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ ''شوکت صدیقی'' کا مشہور ناول ''خدا کی بستی''، ع۔س۔ مسلم صاحب نے اس وقت شائع کیا جب کراچی کا کوئی اور اشاعتی ادارہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مسلم صاحب نے اس کی پوری رائلٹی ادا کی اور ایک اچھا ناشر ہونے کا ثبوت دیا اور اس کے حقوق اشاعت حاصل کئے، لیکن جب ''خدا کی بستی'' کو ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی تو شوکت صدیقی نے شہرت کی اس چاندنی میں ادبی اخلاقیات پر عمل نہ کیا۔ انہوں نے یہ ناول کسی اور ناشر کے پاس بھی فروخت کر دیا، پھر معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ ع۔س۔ مسلم صاحب نے یہ تمام واقعہ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اپنے

Marfat.com

تلخ تجربات کے سلسلے میں لکھا ہے۔ میں نے اپنی آپ بیتی میں اس قسم کے لکھنے والوں کو ''دکھری ٹائپ کے مصنفین'' کے باب میں کسی کا نام لئے بغیر پیش کیا ہے۔

اِن تجربات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ع۔س۔ مسلم صاحب نے ادبی صحافت کو خیر باد کہہ دیا اور اب زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرنے لگے۔ وہ ۱۹۲۲ء میں بھارت کے ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں پاکستان آ گئے۔ ابتدائی تعلیم جالندھر میں حاصل کی اور تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں شہر کے بچوں کے ساتھ خوب نعرہ بازی کی۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی ان کا رجحان ادب اور دین اِسلام کی طرف ہو گیا تھا۔ پیشہ وارانہ زندگی کے لئے انہوں نے تجارت کا میدان منتخب کیا اور ادب کو شوق کے طور پر قائم رکھا۔ اب وہ نوے کی دہائی میں قدم رکھ چکے ہیں، لیکن ادب کا ذوق وشوق اسی طرح قائم ہے بلکہ اب دو آتشہ ہو گیا ہے، یعنی وہ پہلے اخبارات اور رسائل میں قومی اور ملکی مسائل پر مضامین لکھتے ہیں اور پھر اپنے مطالعے کا تمام حاصل اپنی کتابوں میں پیش کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس وقت ملک کے ایک کثیر التصانیف مصنف ہیں جن کے چہرے پر خوبصورت سفید داڑھی لہرا رہی ہے۔ سر پر قراقلی ٹوپی سجی ہے۔ آنکھوں سے دین کا نور جھلکتا ہے اور وہ ایک بے حد مقدس شخص نظر آتے ہیں جس کی تنویر پر وقت کا اندھیرا بھی اثر انداز نہیں ہو سکا۔

ع۔س۔ مسلم صاحب اب ملک کے ایک اہم مصنف شمار ہوتے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے تجارت کو بھی پوری اہمیت دی اور جب

''کچھ اور چاہیے وسعت میرے عمل کے لئے''

کا خیال آیا تو اپنا کاروبار کراچی سے خلیجی ریاستوں تک پھیلا دیا اور اس کے ساتھ ہی خلقِ خدا کی خدمت کے لئے ''رحمت وقف''..... ''رحمت ہسپتال'' اور ''سوسائٹی برائے ذہنی پسماندگان'' بھی قائم کی۔

میں نے اُوپر ع۔س۔ مسلم صاحب کی زندگی کا مختصر اجمال پیش کیا ہے اور اب یہ بات

Marfat.com

بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ان کی شخصیت کا بنیادی زاویہ ''ادب'' ہے اور اس میں پاکستانی معاشرے کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ان کی تخلیقی شخصیت کے تین زاویئے اہم ہیں۔

اوّل شاعر کی حیثیت سے وہ نظمیں اور غزلیں لکھتے ہیں، اب شاعری کا رُخ حمد و نعت و منقبت کی طرف بھی پھر گیا ہے۔

دوم۔ادیب کی حیثیت میں افسانہ و انشاء پردازی ان کی محبوب صنف ہے، لیکن اب افسانے کی صنف پس منظر میں چلی گئی ہے اور وہ زندگی کے اہم موضوعات پر ادبی مضامین میں اپنی انشاء پردازی کا جوہر دکھاتے ہیں، جس میں فکر کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ان کی نثر میں ایک خاص قسم کی دلکشی ہے جو پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے اور مطالب و معانی اس کے دل میں اُتار دیتی ہے۔

سوم۔ایک صاحبِ نظر دانشور کی حیثیت میں وہ سیاسی، سماجی اور تہذیبی مضامین لکھتے ہیں اور اہلِ مغرب کو جو ''تاریخ کے خاتمے'' کا اعلان کرتے رہتے ہیں، علامہ اقبال کے الفاظ میں باور کراتے رہتے ہیں کہ:

''تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی''

ع۔س۔مسلم اسی قسم کے مضامین مغرب کو یاد کراتے ہیں کہ تاریخ ختم نہیں ہوئی بلکہ یہ حکمتِ قرآنی کے تحت مسلسل آگے بڑھتی چلی جائے گی اور انہوں نے شاخِ نازک پہ جو آشیانہ بنایا ہے وہ ناپائیدار ثابت ہوگا او جاپان پر پہلا ایٹم بم گرانے والے شاید تیسری دُنیا کے جوہری انتقام کا نشانہ بن جائیں۔

ع۔س۔مسلم صاحب سے میرا پہلا تعارف ان کی کتابوں کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں ہی ہوا تھا۔ وہ اکثر لاہور تشریف لایا کرتے تھے اور کسی سات ستارہ ہوٹل میں قیام کرتے تھے۔ان کی آمد کی خبر سن کر لاہور کے پیشہ ور ناشرین اُمنڈ پڑتے، لیکن مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ مسلم صاحب مقبول اکیڈمی پر خود قدم رنجہ فرماتے اور میری فرمائش پر نعتوں کی نئی

Marfat.com

کتاب کا مسوّدہ میرے حوالے کر دیتے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان کے ساتھ کاروباری معاملے کی بات کبھی نہیں ہوئی اور انہوں نے مجھے اپنا فرض خود ادا کرنے کا موقعہ دیا۔ مقبول اکیڈمی سے ان کی کتابیں..... کاروانِ حرم..... حمد و نعت..... حمدِ باری..... زبورِ نعت..... کعبہ و طیبہ..... زمزمۂ اسلام..... زمزمۂ درود اور اللہ و رسولؐ شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی پنجابی شاعری کی کتاب ''واگاں میں وَل موڑ'' ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ ع۔س۔ مسلم کی خودنوشت سوانح عمری بھی چھپ چکی ہے اور اس میں کراچی کی زندگی کو پیش کرنے کی عمدہ کاوش کی گئی ہے۔ بعض ادیبوں کا تذکرہ ان کے کردار کے نئے زاویوں کو سامنے لاتا ہے اور بالواسطہ طور پر یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ع۔س۔ مسلم صاحب نے ضرورت مند ادیبوں کی مالی معاونت سے کبھی گریز نہیں کیا، لیکن ان کے سامنے غلط کوائف پیش کر کے پیسہ بٹورنے والے ادیبوں کی بھی کمی نہیں۔ ع۔س۔ مسلم صاحب کے ظرف کی وسعت دیکھئے کہ وہ اس قسم کے ادیبوں کا نام نہیں لیتے بلکہ کہتے ہیں کہ میری ہتھیلی کا میل اُتر گیا ہے۔

ع۔س۔ مسلم ۹۰ سال گزار لینے کے بعد بھی صحت مند ہیں، چاق و چوبند ہیں، توانا ہیں۔ ان کا قلم روانی سے چل رہا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ میں انہیں ''علامہ ع۔س۔ مسلم'' لکھوں۔ اُمید ہے کہ آپ بھی میری تائید کریں گے۔

Marfat.com

احسان دانش

ملک کے ممتاز شاعر احسان دانش سے میری نیازمندی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب میں نے اپنا گاؤں چھوڑ کر قسمت آزمائی کے لئے لاہور میں مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رسالہ ''چودھویں صدی'' شروع کرنے کا خیال تو مجھے پرائمری سکول کی معلّمی کے زمانے میں ہی ستانے لگا تھا۔ میں نے اس کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ میں لاہور آیا تو رسالہ ''چودھویں صدی'' کا منصوبہ بھی میرے ساتھ آیا۔ لیکن مجھے احساس تھا کہ میں اس کے انتظامی امور تو انجام دے سکتا تھا لیکن ادب کی اصنافِ نظم و نثر میرے محدود مطالعے میں شامل ہونے کے باوجود میری دسترس میں نہیں تھیں اور ان کے فنی معاملات سے تو میں بالکل ناواقف تھا۔ میں نے جناب احسان دانش کو لاہور کے مشاعروں میں سنا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ انہوں نے زندگی کا آغاز ایک مزدور کی حیثیت میں کیا تھا لیکن علم حاصل کرنے کی لگن جاری رکھی اور آج ملک کے مشہور و معروف شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ مشاعرہ ختم ہوتا تو نوعمر لڑکے انہیں گھیر لیتے اور وہ ایک سچے استاد کی حیثیت میں ہر ایک سے شفقت سے پیش آتے۔ ان کے

Marfat.com

سوالات غور سے سنتے اور اپنے جوابات خندۂ پیشانی سے دیتے۔ مجھے رسالہ ''چودھویں صدی'' کے لئے انہیں سے ادبی راہنمائی حاصل کرنے کا خیال آیا اور ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ان دنوں احسان دانش نے اپنا ذاتی مکتبہ ایبک روڈ پر بنا رکھا تھا۔ مکتبہ کیا تھا؟ دراصل یہ شاعروں کی بیٹھک تھی۔ نوجوان شعراء احسان دانش صاحب کو اپنی غزلیں دکھانے آتے تھے، سینئر شعراء آتے تو اپنا کلام سناتے، عالم یہ ہوتا کہ مکتبۂ دانش میں ہر وقت مشاعرہ برپا رہتا۔ چھ شاعر آ رہے اور چار اٹھ کر جا رہے ہیں، سادہ چائے کا دور چل رہا ہے۔ ایک دن میں بھی اس محفل میں جا بیٹھا، پہلے تو باتوں کا لطف اٹھاتا رہا اور جب مجمع ختم ہو گیا تو حرفِ مطلب زبان پر لے آیا۔ احسان دانش صاحب نے اپنی ادبی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ادبی رسالے کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک ادیب کی ضرورت ہے جو نظم و نثر کی پرکھ پہچان اور زبان پر عبور رکھتا ہو اور پرچے کو پورا وقت دے سکے''.....اور پھر دو ٹوک فرمایا۔

''میں تو پورا وقت نہیں دے سکتا''

ان کا یہ جواب سن کر میں پریشان ہو گیا۔ انہوں نے میری پریشانی بھانپ لی لیکن جب میں نے یقین دلایا کہ میں رسالہ ''چودھویں صدی'' کے مالی مسائل کو خطرے میں نہیں پڑنے دوں گا تو وہ بولے۔

''اچھا مقبول احمد، ہم کام بانٹ لیتے ہیں۔ پرچے کے ادبی امور انجام دینے کے لئے ایک کل وقتی ملازم رکھ لو۔ مضامین نظم و نثر کی فراہمی کا میں ذمہ لیتا ہوں، مالی امور تم سنبھال لو''۔

دراصل میرے ذہن میں بھی اسی قسم کی تجویز تھی لیکن مجھے اس کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ جب انہوں نے خود ہی یہ قابلِ عمل منصوبہ ارشاد فرمایا تو میں نے انہیں تعمیل کا یقین دلایا۔ اب ایک اور سوال کرنے کی ہمت مجھے نہیں پڑ رہی تھی۔ جو میرے ذہن میں شروع سے موجود تھا اس کا حل بھی انہوں نے خود ہی نکالا اور فرمایا:

''میری حیثیت پرچے میں اعزازی ہو گی، کسی ادیب کو اعزازیہ دینا ضروری ہوا تو

Marfat.com

آپ کو بتادوں گا۔کل وقتی ادیب کو مناسب تنخواہ آپ خود مقرر کرلیں''۔

اس کام کے لئے محمد اکرم کا انتخاب احسان دانش صاحب نے ہی کیا۔وہ اچھے شاعر اور نثر نگار لیکن نام ونمود اور شہرت سے بے نیاز تھے۔''چودھویں صدی'' کے سرِورق پر احسان دانش صاحب کا نام نمایاں چھپتا تھا۔

یہ مختصر سی کہانی رسالہ ''چودھویں صدی'' سے جناب احسان دانش کی وابستگی کی ہے۔ان کا نام اتنا بڑا تھا کہ اس نئے رسالے کو ملک کے تمام بڑے بڑے شاعروں' افسانہ نگاروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔احسان دانش نہ صرف اداریہ خود لکھتے بلکہ اکثر اوقات اہم موضوعات پر مقالات بھی قلم بند فرماتے جو پورے ملک میں گہری دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے اور اب یہ بات حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ ''چودھویں صدی'' احسان دانش صاحب کا پرچہ موسوم ہوتا تھا اور اس کی ادبی حیثیت انہیں کے نام سے تھی۔تاہم انہوں نے مجھے اس شرط کا پابند بنا رکھا تھا کہ اس پرچے میں چھپنے والے سب مضامین میں خود بھی پڑھا کروں گا اور جو بات مجھے سمجھ نہیں آئے گی اس کی وضاحت خود احسان دانش فرمائیں گے۔اس وقت تو مجھے یہ مشقت نظر آتی تھی لیکن اب سوچتا ہوں تو واضح ہو جاتا ہے کہ احسان دانش میری ادبی تربیت کر رہے تھے۔مطالعے کا ذوق پیدا کر رہے تھے۔مضامین کی پرکھ پہچان کا سلیقہ پیدا کر رہے تھے۔چنانچہ یہ تربیت اس وقت میرے لئے بڑی سودمند ثابت ہوئی جب میں نے مقبول اکادمی شروع کی اور ادیبوں کے مسودوں کا فیصلہ کرنا میری ذمہ داری بن گئی۔احسان دانش کا احسان یہ تھا کہ ایڈیٹر محمد اکرم کے ساتھ جب میں مسودے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ سب کام چھوڑ کر اپنے شاگردوں کی موجودگی میں ہمیں وقت دیتے اور ''چودھویں صدی'' کے لئے معیاری مضامین کے مسوّدوں کا فیصلہ صادر فرما دیتے۔اسی دوران وہ مضمون کے بارے میں رائے دیتے تو اس کے مصنف کے بارے میں بھی ہماری معلومات میں اضافہ کرتے جاتے تھے۔

احسان دانش صاحب سے عقیدت کا یہ تعلق ان کی زندگی کے آخری ایام تک قائم

Marfat.com

رہا۔ حالانکہ رسالہ ''چودھویں صدی'' تین چار سال کے بعد بند کر دینا پڑا۔ اس کے بند کرنے میں بھی احسان دانش کا مشورہ شامل تھا کہ نقصانِ مایہ کب تک برداشت کرو گے اور مفت پڑھنے والوں کے ذوق کی آبیاری کب تک کرو گے؟

میں نے مقبول اکیڈمی کا منصوبہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے پسند فرمایا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ رئیس احمد جعفری سے ان کے ناول اشاعت کے لئے حاصل کرنے کا مشورہ بھی انہوں نے ہی دیا تھا۔ میں اپنے ادارے کی کامیابی کا حال انہیں سناتا تو خوش ہوتے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لیتے۔ ان کی شاعری کی کتاب ''نفیرِ فطرت'' شائع ہوئی تو وہ خود میرے دفتر میں تشریف لائے اور اس کی خوبصورت پیشکش کی تعریف کی۔

ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ان کے پاس ایک نایاب کتاب ہے، جو چھپ گئی تو اردو دنیا ''مقبول اکیڈمی'' کی شکر گزار ہوگی۔ یہ کتاب فرانس کے نامور مؤرخ گستاؤلی بان کی ''تمدن عرب'' تھی۔ یہ کتاب اس سے قبل نواب حیدر آباد دکن کی سرپرستی میں چھپ چکی تھی اور اس کا ترجمہ سید علی بلگرامی نے کیا تھا، اب یہ کتاب نایاب تھی۔ میں ایک عرصے سے اس کتاب کی اشاعت کا ارادہ کر رہا تھا لیکن ہر دفعہ ہمت جواب دے جاتی تھی، اب احسان دانش صاحب نے راہنمائی کی تو میں نے کتاب کا دستیاب نسخہ ان سے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ یہ کتاب بھی ''مقبول اکیڈمی'' کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی اور میں نے بعد میں ''سیرت ابنِ ہشام''.....''عبرت نامہ اندلس''، ''تمدنِ عرب'' اور ''تمدنِ ہند'' جیسی ضخیم کتابیں چھاپنے کا حوصلہ بھی پیدا کر لیا حقیقت یہ کہ میں نے مقبول اکیڈمی کا آغاز اردو ناولوں کی اشاعت سے کیا تھا لیکن ''تمدنِ عرب'' کی اشاعت سے اس میں ایک مقدس اضافہ ہو گیا۔

احسان دانش ادبی دنیا میں ایک مزدور شاعر کی حیثیت میں شہرت رکھتے تھے اور اپنی محفل میں شاگردوں اور سینئر ادیبوں کے سامنے کہتے تھے کہ بچپن میں انہیں والد نے بکریاں پال کر دی تھیں، وہ انہیں چرانے کے لئے جنگل میں لے جاتے، بکریاں چرتی رہتیں اور احسان دانش

Marfat.com

کتاب پڑھتے رہتے۔کاندھلہ ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے، پرائمری تک تعلیمی مقامی مدرسے میں حاصل کی اور اتنی استعداد حاصل کرلی کہ ''قصہ حاتم طائی''، ''باغ و بہار'' اور ''آبِ حیات'' پڑھنے لگے۔دہلی میں ایک پریس میں نوکری کرلی، دل نہ لگا تو لاہور آ گئے۔ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کی عمارت بن رہی تھی، احسان دانش نے اس کی تعمیر میں اینٹیں ڈھوئیں اور گارا بنایا۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۳۱ء میں ''حدیثِ ادب'' کے نام سے چھپا اور پھر ان کی شاعری کی ستائش وتعریف اور ان کے ذہنی اور فنی مرتبے کا اعتراف سب نے کیا لیکن احسان دانش نے سادگی اور درویشی کو اپنی زندگی کا شعار بنایا۔انہوں نے اپنے کردار سے ایک با اخلاق انسان ہونے کا ثبوت دیا اور زمانے کی کسی کجی کو قبول نہ کیا۔ان کی خودنوشت سوانح حیات ''جہانِ دانش'' میرے لئے ہمیشہ ایک راہنما کتاب ثابت ہوتی رہی۔ مجھے جب بھی زمانہ مشکلات سے دوچار کرتا تو میں احسان دانش کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کی باتیں سنتا اور میرا ٹوٹا ہوا حوصلہ قائم ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔(آمین)

Marfat.com

احمد پراچہ

احمد پراچہ صوبہ خیبر پختون خواہ (جو پہلے صوبہ سرحد کے نام سے موسوم تھا) کے وہ دانشور ہیں جنہوں نے اردو ادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے اور اسے ہمیشہ وفاداری بشرط استواری کا درجہ دے کر اپنے شہر کوہاٹ کو اردو ادب میں حیات جاوید عطا کر دی ہے۔ انہوں نے صلہ وستائش کی کبھی پروا نہیں کی اور ادب کے نام کو ہمیشہ زندگی کے دیگر امور پر فوقیت دی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وسائل کی نایابی ان کے رستے میں کبھی حائل نہیں ہوئی اور انہوں نے اردو ادب کی خدمت کے لئے کبھی کسی سے مالی معاونت کی خواہش بھی نہیں کی۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصر طور پر ان کے حالات حیات پیش کر دیئے جائیں۔

احمد پراچہ ۳ جنوری ۱۹۳۶ء کو صوبہ سرحد (جو اب خیبر پختون خوا ہے) کے مشہور شہر کوہاٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم غلام حسین پراچہ ایک علم دوست انسان تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم پر پوری توجہ دی لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے احمد پراچہ نے سکول کی تعلیم صرف نویں درجے تک حاصل کی لیکن مطالعے کا شوق زندہ رکھا۔ عملی زندگی کی دہلیز پر قدم رکھا تو انہیں اپنی تعلیمی کمی کا احساس ہوا۔ چنانچہ پشاور میں قائم شدہ سیکنڈری تعلیمی بورڈ سے ''پرائیویٹ ان

Marfat.com

اردو'' اور ''آنرز ان اردو'' کے امتحانات پاس کئے۔ تاہم یہ بات نظر انداز نہ کی جائے وہ اپنے بچپن میں ہی کہانیاں تخلیق کرنے لگے تھے۔ ان کی پہلی کہانی ''تین دوست'' بچوں کے مقبول رسالہ ''ہدایت لاہور'' میں ۱۹۵۳ء میں چھپی تھی۔ اس دور میں ہی انہوں نے متعدد اردو اخبارات کے ضلعی نامہ نگار کی خدمات انجام دیں اور صحافت کی دنیا میں اپنی اعلیٰ خبر رسانی (رپورٹنگ) سے نام پیدا کیا۔

صحافت احمد پراچہ کی منزل نہیں تھی۔ یہ صرف ان کا وسیلہ رُوزگار تھا۔ ان کا عشق تو ادب کے ساتھ تھا اور وہ اردو کے فروغ کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل رہتے تھے۔ انہوں نے ادب کی سچی خدمت اور نوجوانوں کی تربیت کے لئے متعدد ادبی انجمنیں کوہاٹ میں قائم کیں ان میں سب سے اہم تو ''انجمن ترقی اردو'' ہے جس کے بانی بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ احمد پراچہ نے اس کی کوہاٹ شاخ کو نئے زاویوں سے آراستہ کیا۔ ''بزم شعاع ادب'' اور ''بزم خیابانِ ادب'' کوہاٹ کی مقامی انجمنیں تھیں جن کی صدارت کا اعزاز احمد پراچہ کو حاصل ہوا اور ان کی قیادت میں اردو ادب کی اس دور کی بستی سے بہت سے ادیب رونما ہوئے۔ ادب کے ساتھ دیگر فنون لطیفہ کے لئے ''کوہاٹ کونسل آف آرٹس'' قائم کی گئی تو انہیں مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ احمد پراچہ اس وقت بھی اس آرٹ کونسل کے ادب کے مشیر ہیں اور اعلیٰ ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے انہیں ۱۹۷۰ء میں انجمن ترقی اُردو لاہور کی طرف سے ''خادم اردو'' کا اعزاز عطا کیا اور ''سند اعتراف'' سے سرفراز فرمایا۔ ان کی کتاب ''کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء'' پر پاکستان رائیٹرز گلڈ نے ۸۵۔۱۹۸۴ء کا آدم جی ادبی ایوارڈ عطا کیا۔

احمد پراچہ کا ادبی ذوق کسی ایک صنف تک محدود نہیں' مختلف موضوعات پر اردو میں کتاب لکھنے والے نامور مصنف ہیں۔ وہ کوہاٹ کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کا ناول ''گلشن'' ۱۹۶۰ء میں چھپا اور یہ اس وقت کوہاٹ سے شائع ہونے والی اردو کی پہلی تخلیقی کتاب تھی۔ کوہاٹ سے اخبارات اور پولیٹیکل قسم کے رسائل تو پہلے بھی شائع ہوتے رہے ہیں لیکن ایک خالص ادبی

Marfat.com

رسالہ ''نایاب'' کے نام سے احمد پراچہ نے ۱۹۸۵ء میں نکالا جسے بہت پسند کیا گیا اور اسے نامور ادیبوں کا تعاون حاصل رہا۔ ''نایاب'' پہلا ادبی رسالہ تھا جس نے ادب کے افق پر کوہاٹ کا نام روشن کیا اور اس کے خصوصی شمارے اب ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر حوالے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

احمد پراچہ کے ادبی موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے زندگی کو وسیع تر نظر سے دیکھا تو ناول ''خلش'' تخلیق کیا۔ زندگی کے انفرادی واقعات پر افسانے ان کی کتاب ''سوتی جاگتی گلیاں'' میں محفوظ ہیں۔ تاریخ نگاری کے زاویئے سے انہوں نے اپنی کتاب ''کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء'' پیش کی جو درحقیقت کوہاٹ کا ادبی تذکرہ اور اس شہر کے ادبی خدمات سے حوالے کی کتاب ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''تاریخ کوہاٹ'' سیاسی و سماجی و تہذیبی حالات پر مشتمل ہے۔ احمد پراچہ کی اس خدمت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنی ذاتی شہرت کی بجائے اپنے عہد کی نامور شخصیات پر کتابیں لکھیں۔ ادبی شخصیات میں سے انہوں نے افسانہ نگار زیتون بانو' شاعرہ پروین شاکر' شاعر اور ادیب ایوب صابر اور ماہر تعلیم منور رؤف پر اچھی کتابیں تالیف کیں۔ سماجی اور سیاسی شخصیت میں سے سائیں احمد علی پشاوری' بیگم نسیم ولی خان' سید رسول شاہ بخاری' مولانا احمد گل اور غلام حیدر اختر پر ان کی کتابیں قبول عام حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی شاعری اور مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ''اردو ادب کی ترقی پسند تحریک'' پر ان کی کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے' جو ادبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی ہے۔ ان کی ایک کتاب ''پروین شاکر فکر و فن'' میرے ادارے مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

میں احمد پراچہ کو ان خوش قسمت ادیبوں میں شمار کرتا ہوں جن کی پذیرائی ان کی زندگی میں کی گئی اور ان کی خدمت میں ایوارڈ پیش کئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ (کتاب کوہاٹ کا ذہنی ارتقاء) کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انہیں احمد فراز ایوارڈ برائے ادب ۱۹۹۷ء میں اور حاصل زندگی ایوارڈ ۲۰۰۱ء میں عطا کیا گیا۔ حسن کارکردگی کا اعلیٰ ایوارڈ انہیں ادارہ فروغ ہند کو (پشاور) نے ۱۸ دسمبر

Marfat.com

۲۰۰۳ءکو پیش کیا۔

احمد پراچہ جب کبھی لاہور آئیں مجھے ملاقات کا شرف عطا کرتے ہیں اور مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے مل رہا ہوں جو علاقائی اور صوبائی تعصب سے پاک ہے' اور بلند تر انسانیت میں یقین رکھتا ہے۔ کچھ لوگ انہیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ انہوں نے ادب میں فعال شرکت کر کے بہت کھویا اور کم پایا ہے' لیکن احمد پراچہ اس قسم کی بات کو اہمیت نہیں دیتے۔ ایک لاہوری ادیب نے میرے ادارے میں ان سے ایک ناگوار بحث چھیڑ دی لیکن احمد پراچہ ان کے ہر وار کو ہنس کر ٹالتے رہے اور جب انہوں نے صرف کوہاٹ کے بارے میں اپنی کتابوں کا ذکر کیا اور پوچھا کہ لاہور کے کسی ادیب نے اپنے محبوب شہر لاہور کے بارے میں اتنی کتابیں لکھی ہیں تو اس ادیب کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ دوسری طرف احمد پراچہ لاہور کے بیشتر ادیبوں کی خدمات کا اعتراف کشادہ دلی سے کر رہے تھے اور لاہور کو اردو ادب کا بڑا مرکز بھی تسلیم کر رہے تھے۔ احمد پراچہ نے اردو میں کتابوں کے انبار لگا دیئے ہیں' اس شہر کی تنہائی میں وہ اپنا وقت ضائع نہیں کرتے اور پیہم لکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لاہور کے ممتاز ترین ادیب ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور صوبہ خیبر پختون خوا کے مرکزی شہر پشاور نے ان کو ''لائف اچیومنٹ ایوارڈ پیش کیا۔ میں ان کی ادب دوستی کا اعتراف کرتا ہوں اور ان کی محبت کا اسیر ہوں۔

Marfat.com

ڈاکٹر اختر شمار

اختر شمار کا ادبی ستارہ ملتان کے افق پر چمکا تھا۔ جہاں ان کی پیدائش ۱۷ اپریل ۱۹۶۰ء کو ہوئی۔ والدین نے ان کا نام محمد اعظم خان رکھا لیکن انہوں نے عظمت کے پیدائشی تصور کو قبول نہ کیا اور اپنی قسمت آپ بنانے کے لئے اختر شماری شروع کر دی۔ ستاروں کی چال دیکھتے دیکھتے ان کے اندر سے شاعر نمودار ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ انہیں بیدل حیدری نے شاعر بنایا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے حیدر دہلوی کی شاعری پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ اور درس و تدریس کے شعبے میں آ گئے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج قصور، دیال سنگھ کالج لاہور، اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں طلبا اور طالبات کے ذوقِ ادب کو سنوارنے کے لئے استاد اردو کی خدمات انجام دیں۔ ترقی کے اگلے زینے پر پہنچے تو وہ ایف سی کالج لاہور میں شعبۂ اردو کے صدر بنا دیئے گئے۔ جب اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو انہوں نے متعدد طلبہ کو اردو میں پی ایچ ڈی کرنے کی راہ دکھائی اور ان کے لئے ایسے موضوعات منتخب کئے جن پر پہلے اس سطح کا کام نہیں ہوا تھا۔

اختر شمار نے لاہور میں ادبی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ حلقہ ارباب ذوق کے

Marfat.com

پلیٹ فارم کے لئے سیکرٹری کا انتخاب لڑا اور اپنے حریف کو شکست فاش دی۔ ادبی جریدہ نگاری کو سیاسی رنگ دینے کا کریڈٹ بھی اختر شمار کو حاصل ہے۔ اس نوع کا پہلا ادبی جریدہ ''بجنگ آمد'' کے نام سے جاری کیا جس میں ادب اور ادیب کے علاوہ ادبی معاشرے کی سیاست کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ اختر شمار نے لاہور کے دو مشہور ادبی گروہوں کی ''جنگ'' کو اس پرچے میں خصوصی اہمیت دی لیکن اپنی غیر جانبداری پر حرف نہیں آنے دیا۔ اپنے اداریوں میں ڈاکٹر صاحب نے ادبی گروہ بندیوں کی ہمیشہ مخالفت کی اور خود بھی کسی ادبی گروہ سے وابستگی اختیار نہیں کی۔ وہ اپنی تخلیق پر زیادہ محنت کرتے تھے۔ لیکن اس بات کے لئے کبھی فکر مند نہیں ہوئے کہ ان کی غزل فنون اور اوراق میں شائع نہیں ہوئی جبکہ ان کے تعلقات احمد ندیم قاسمی سے بھی عقیدت مندانہ تھے اور وہ وزیر آغا صاحب کو اردو ادب کا عظیم ادیب تسلیم کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اختر شمار فطری شاعر ہیں' جدید غزل میں ان کی منفرد آواز کی توانائی تسلیم کی جا چکی ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے حقیقی تجربے سے پیدا ہوئی ہے اور ان کے اشعار میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ ان کے شعری مجموعے ''روشنی کے پھول'' ..... ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' ..... ''یہ آغاز محبت ہے'' ..... ''جیون تیرے نام'' ..... ''ہمیں تیری تمنا ہے'' ..... ''آپ سا کوئی نہیں'' ..... ''اور تم ہی میری محبت ہو'' چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کی تحقیقی کتابوں میں ''جنوبی ایشیا کی مسلم تہذیب'' اور ''فکر کا مطالعہ'' ..... ''بھرتری ہری ایک عظیم شاعر'' بہت اہم ہیں۔

ڈاکٹر اختر شمار معاشرے کو تنقیدی آنکھ سے دیکھنے والے ادیب ہیں' وہ مثبت نقطۂ نظر کے دانشور ہیں اور تعمیری تنقید میں یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تہذیبی اور معاشرتی تصورات کو اپنے کالموں میں پیش کیا۔ روزنامہ ''خبریں'' اور ''ایکسپریس'' کے بعد اب ان کے کالم پاکستان کے واحد نظریاتی اخبار ''نوائے وقت'' میں چھپتے ہیں۔ ان کے کالموں کے دو مجموعے ''میں بھی پاکستان ہوں''۔ اور ''ہم زندہ قوم ہیں'' مقبول اکیڈمی سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اور ایک

Marfat.com

کتاب ''خطوں میں دفن محبت'' بھی مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر اختر شمار کو حکومت پاکستان نے مصر میں ''مسند اردو'' کے لئے منتخب کیا اور وہ ان دنوں قاہرہ یونیورسٹی میں مصریوں کو اردو پڑھا رہے ہیں۔ انہیں اپنے وطن کی یاد آتی ہے تو ''نوائے وقت'' میں کالم لکھتے ہیں جس میں پاکستان کو مصری زایوں سے باخبر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اختر شمار لاہور میں تھے مقبول اکیڈمی پر ہر ہفتے تشریف لاتے اور ہمارے ادارے کی کتابوں کے علاوہ دوسرے ناشرین کی چھپی ہوئی کتابیں بھی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ وہ زیادہ باتیں کرنے اور اپنی انا کے غبار میں ہوا بھرنے والے ادیب نہیں ہیں۔ سرائیکی خطے کے حوالے سے ان کی زبان میں بڑی مٹھاس ہے' اور جونیئر ادیبوں سے بھی اسی طرح پیش آتے ہیں جیسے ان کے سینئر ہوں۔ ایک دفعہ کسی نے کہہ دیا کہ ''آپ احمد ندیم سے بڑے ہیں'' اختر شمار فوراً بولے ہاں' میرا قد ان سے آدھ انچ زیادہ ہے' لیکن میں ان کی عظمت فن اور شرافت کا قائل ہوں'' چنانچہ ان کی انا کو ہوا دینے والے کا وار خالی گیا۔

مصر کے دارالحکومت قاہرہ سے ان کا ٹیلی فون آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ لاہور سے بول رہے ہوں۔ لیکن جب وہ بتاتے ہیں کہ وہ قاہرہ سے بات کر رہے ہیں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

''اختر شمار! لاہور آپ کا انتظار کر رہا ہے''

Marfat.com

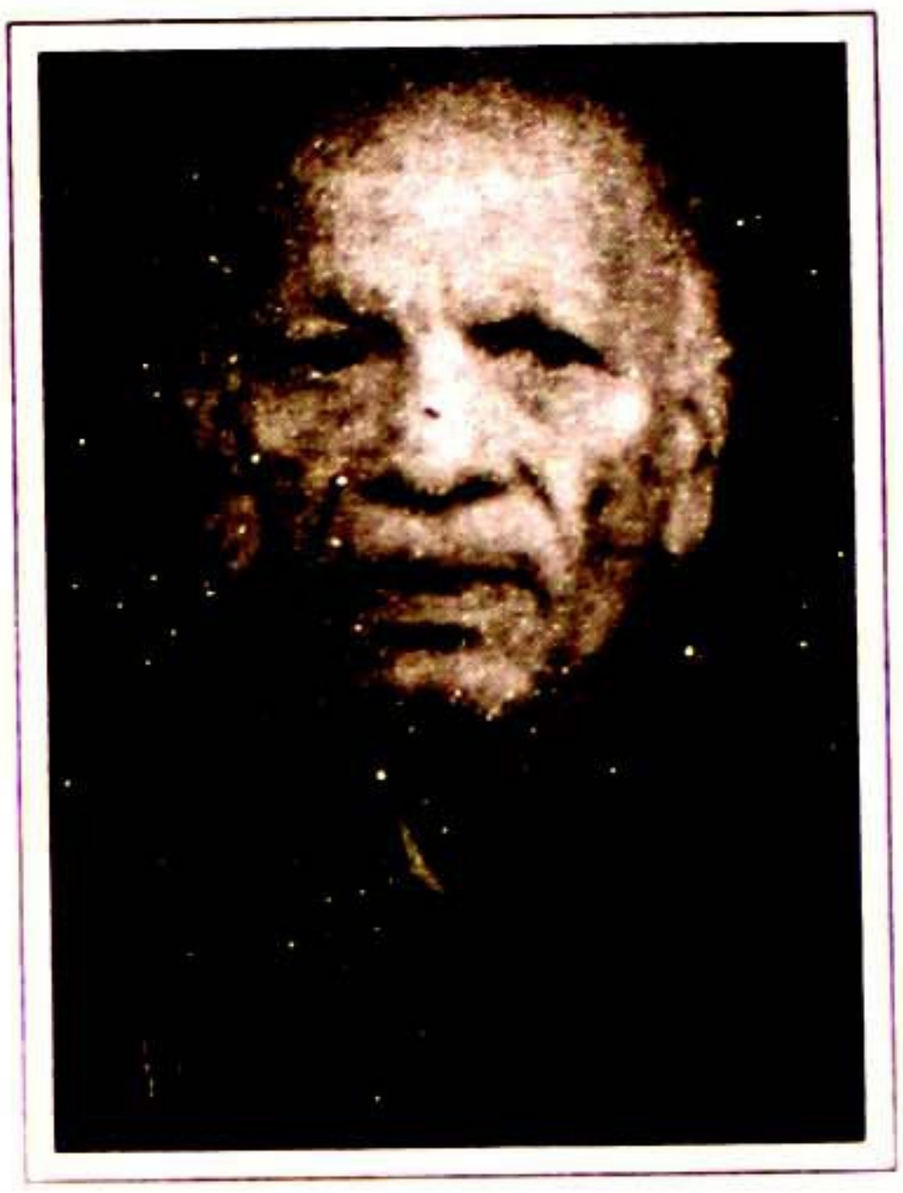

اسرار زیدی

اسرار زیدی اس درویش مزاج شاعر کا نام ہے جو مجید امجد کے دیس منٹگمری (حال ساہیوال) سے وارد لاہور ہوئے تو انہوں نے اپنی سبھا پاک ٹی ہاؤس میں جمالی۔لیکن اپنی توجہ حلقۂ ارباب ذوق پر رکھی جس کے اجلاس ٹی ہاؤس کی دوسری منزل پر ہوتے تھے۔اسرار زیدی نے حلقے کو سب سے زیادہ ادیب اور شاعر دیئے ہیں اور ایک لمبے عرصے تک تو وہ اس کے سیکرٹری کے انتخاب میں بھی نمایاں کردار ادا کرتے تھے' لیکن خوبی یہ کہ اپنی نام ونمود سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ہاں اپنی جگت استادی کا سلسلہ قائم رکھا۔

اسرار زیدی مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ حسین پور میں جو دہلی سے باون میل کے فاصلے پر واقع تھا ۶ نومبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد سید ممتاز احمد پوسٹ آفس کے محکمے میں افسر تھے۔دادا سید غلام حسین زیدی ریاست گوالیار میں پولیس کے چیف تھے' پردادا سید رحمت علی اسی ریاست میں گورنر تھے۔اسرار زیدی نے میٹرک اپنے قصبہ حسین پور سے کیا اور

Marfat.com

بی۔اے کرنے کے لئے اینگلو عربک کالج دہلی میں داخل ہو گئے۔شعر وادب سے انہیں فطری لگاؤ تھا۔مٹی کے تیل کے لالٹین کی روشنی میں کتاب پڑھنے لگتے تو اس وقت تک کتاب نہ چھوڑتے جب تک کہ چراغ کا تیل ختم نہ ہو جاتا۔اس دور میں ہی انہیں شاعری اور صحافت میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔کالج کی تعلیم کے دوران ہی انہوں نے روزنامہ ''جمہور'' میں سیاسی صحافت کا آغاز کیا۔اور ادبی صحافت کے لئے ماہنامہ ''جمالستان'' کی ادارت میں حصہ لیا۔

پاکستان آزاد ہوا اور نقل آبادی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو اسرار زیدی کا خاندان بھی دہلی سے ہجرت کر کے ملتان آ گیا' جہاں ان کے والد کو اپنے سابقہ محکمے میں ملازمت مل گئی اور وہ اس محکمے سے چیف پوسٹ ماسٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔اسی دوران اسرار زیدی کا ادب اور صحافت کا ذوق پختہ ہو چکا تھا۔وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور اس کی تحریکی سرگرمیوں میں ذوق وشوق سے حصہ لیتے تھے۔وہ ملتان سے اوکاڑہ منتقل ہوئے تو یہ سرگرمیاں وہاں بھی جاری رکھیں لیکن اوکاڑہ ان کے وسیع پروگرام اور منصوبوں کے لئے مختصر جگہ تھی۔اسی لئے وہ منٹگمری جو اب ساہیوال سے موسوم ہوتا ہے منتقل ہو گئے۔منٹگمری سے ان دنوں ایک روزنامہ ''خدمت'' شائع ہوتا تھا' اسرار زیدی نے اس پرچے کی ادارت آٹھ سال تک کی اور اسے لاہور کے روزناموں سے زیادہ اہم اخبار بنا دیا جو منٹگمری کے گرد ونواح میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا تھا۔اس اخبار میں ادب کو نمایاں طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ساہی وال سے جتنے شعراء نامور ہوئے ان سب کو اسرار زیدی نے اخبار ''خدمت'' میں پروان چڑھایا تھا۔''خدمت'' کی سیاسی جہت باغیانہ تھی اور ایوب خاں نے مارشل لاء لگایا تو ''خدمت'' کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔اب اسرار زیدی لاہور آ گئے اور یہاں انہوں نے احسان' امروز' ہلال پاکستان کے علاوہ رسالہ ''اقدام'' کے لئے کام کیا۔۱۹۷۰ء کی دہائی میں آئی اے رحمان' عبداللہ ملک اور حمید اختر نے اخبار ''آزاد'' جاری کیا تو اسرار زیدی نے اس کے لئے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔زیدی صاحب ۱۹۷۰ء سے

Marfat.com

ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' میں ادبی کالم نگاری کر رہے ہیں۔لندن کے اخبار ''ایشیا'' برمنگھم کے جرائد ''آئینہ'' اور ''تصویر'' کی ترتیب وتدوین بھی لاہور میں بیٹھ کر انجام دی۔اس تمام عرصے میں اسرار زیدی تصنیف وتالیف کے کام میں بھی مصروف رہے۔ان کے چار شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔اقبال کی دو مشہور کتابوں ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' کی شرح لکھی۔بچوں کے لئے ناول لکھے۔اپنے عہد کی چند نامور شخصیات کے خاکوں کی کتاب ''بام ودر جن سے روشن ہوئے'' میری خصوصی فرمائش پر مرتب کی۔ایف سی کالج کی ایک طالبہ سمعیہ حنیف نے ان کے فن اور شخصیت پر ایم اے کا تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور وہ خود بھی ایم اے، ایم فل کے تحقیقی مقالوں کے ممتحن رہ چکے ہیں۔

پچھلے دنوں کسی نے اچانک ان کی وفات کی خبر اڑا دی۔پھر کیا تھا۔ان سے محبت کرنے والوں کا ان کے گھر پر تانتا بندھ گیا۔ٹیلی ویژن پر اعلان کرانا پڑا کہ اسرار زیدی زندہ ہیں۔ٹی ہاؤس بند ہوا تو سب سے زیادہ دکھ اسرار زیدی کو ہوا۔اس کے بعد انہوں نے کسی اور جگہ اپنا اڈہ جمانا مناسب نہیں سمجھا۔اب اپنی عمر عزیز کا ۸۵واں سال گزار رہے ہیں تو وہ ذہنی طور پر چاق وچوبند ہیں لیکن جسمانی طور پر کمزور پڑتے جا رہے ہیں۔خدا ان کو صحت مند رکھے، میری یہ دعا ہے۔

اسرار زیدی کی زندگی کی متاع عزیز ان کا خلوص ہے۔وہ کم گفتار انسان ہیں لیکن دوسروں کی تمام باتیں غور سے سنتے ہیں۔شاعری میں انہوں نے ہمیشہ انسان دوستی کے موضوعات کو اہمیت دی اور پاکستان کے سہانے مستقبل کے خواب دیکھے۔یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے لیکن اسرار زیدی نے امید قائم رکھی اور اپنی شاعری میں دکھی انسانیت سے ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔اسرار زیدی فطری طور پر حزب اختلاف کے انسان ہیں اور برسر اقتدار حکومتوں سے کبھی بلند بانگ توقعات نہیں رکھتے لیکن وہ اپنے اختلاف کا اظہار زبان سے نہیں کرتے اور بات قلم پر

Marfat.com

آ جائے تو لکھنے سے گریز نہیں کرتے' ان کی حق گوئی بے مثل ہے' ان کی بے باکی بے مثال ہے' ان کی دانشوری اور ترقی پسند فکر کی تحسین تمام ادبی حلقوں میں کی جاتی ہے اور ان کی بزرگی کا احترام کیا جاتا ہے۔ لاہور میں سب ان کے دوست ہیں۔ سب ان کے خیر خواہ ہیں اور ان میں یہ ناچیز مقبول احمد بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی عطا کرے۔ (آمین)

Marfat.com

اظہر جاوید

اظہر جاوید کو میں ان نوجوانوں میں شمار کرتا ہوں جنہوں نے تعلیم کی سندیں حاصل کرنے کے بعد ادب کے تخلیقی کام کو اپنی مرضی سے اختیار کیا اور سرکاری نوکری کی تمنا نہیں کی۔ جب اس قلم کے مصور کی آنکھ کھلی تو وہ سرگودھا کے مشہور شاعر الطاف مشہدی کے پاس پہنچ چکا تھا، جس نے اظہر جاوید کو اپنے ہفت روزہ اخبار ''خلوص'' کی ادارت پیش کر دی۔ اس دور میں ہی اس کا رابطہ جناب جوہر نظامی سے ہوا جو سرگودھا میں ممتاز الشعراء شمار ہوتے تھے۔ ان دو نامور شاعروں نے شاعری اور ادب کے اس بیج کو پروان چڑھانے میں مدد دی جو سرگودھا کے نواحی قصبے بھاگٹانوالہ میں اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا۔ پھر اخبار ''خلوص'' اور شہر سرگودھا اسے محدود نظر آنے لگا اور وہ اونچی اڑان کے لئے لاہور پہنچ گیا جہاں اخبار ''امروز'' کا ادبی صفحہ اس کی جدت درازیوں کے لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

میں اپنی خودنوشت میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو پہلے رسالہ ''چودھویں صدی'' نکالا۔ ناکام ہوا تو کتابوں کی اشاعت کی طرف آ گیا۔ اظہر جاوید نے بھی پہلے ادبی زندگی کا آغاز اخبار ''خلوص'' سے کیا لیکن وہ اسے کامیاب کر کے نئے اور کھلے میدان کی تلاش میں لاہور آ گیا۔ اور ''امروز'' کے ادبی صفحہ کی ترتیب و تدوین کے ساتھ ایک ماہانہ جریدہ

Marfat.com

''تخلیق'' کے نام سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ میں تو ''چودھویں صدی'' کی تعمیر کے چوتھے زینے پر ہی سرنگوں ہو گیا تھا لیکن اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کو اتنی کامیابیوں سے سرفراز کیا کہ وہ ادب لطیف' سویرا' نقوش' فنون اور اوراق جیسے ضخیم ادبی پرچوں کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس بھی دلانے لگا۔ محمد طفیل کی وفات کے بعد ''نقوش'' اور احمد ندیم قاسمی کی وفات کے بعد ''فنون'' کی اشاعت منقطع ہو چکی ہے۔ ''اوراق'' گزشتہ چار سال سے منظر عام پر نہیں آیا۔ ''سویرا'' بے قاعدگی سے چھپتا ہے۔ البتہ ''ادب لطیف'' کو صدیقہ بیگم نے اشاعتی سہارا دے رکھا ہے لیکن ''تخلیق'' واحد ادبی پرچہ ہے جو باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اظہر جاوید عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے، لیکن میں اس کا احترام بڑوں کی طرح کرتا ہوں۔ وہ جب کبھی مقبول اکیڈمی پر آئے تو میں اس کا استقبال دروازے پر کرتا ہوں اور خود اس کے دفتر میں جاؤں تو دروازے پر دستک نہیں دیتا تا کہ اظہر جاوید اپنی مسند پر کھڑے نہ ہو جائے۔ اظہر جاوید سے دوستی کا یہ رشتہ سالہا سال سے چل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کا احسان مند ہوں۔ لیکن اس کا ناشر نہیں ہوں۔ اظہر جاوید میرے خیال میں لاہور کا واحد ادیب ہے جو اپنی کتابوں کی اشاعت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اپنی شاعری کی کتاب نہ چھپوانے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

''یہ احساس میں نے خود پیدا کر لیا تھا کہ اتنے عظیم لوگوں کے ایسے باکمال کلام کے سامنے اپنا کھردرا اور پھیکا اثاثہ کیا رکھوں (اور کیوں رکھوں)'' محترم سلیم ہاشمی اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اس واہمے کو توڑا اور اس کی شاعری کی کتاب چھپوا دی۔ مجھے ملال ہی رہا کہ ''غم عشق اگر نہ ہوتا'' ایک اور ادارے نے شائع کی ہے۔ دوسری طرف اظہر جاوید نے یہ اعزاز مجھے عطا کیا کہ اس نے مقبول اکیڈمی کو کئی نامور مصنفین سے متعارف کرایا۔ ان سے کتابیں حاصل کر کے میرے ادارے سے چھپوائیں۔ میرے حلقۂ مصنفین میں بے پناہ اضافہ کیا۔ بلاشبہ وہ مقبول اکیڈمی کی کامیابیوں میں ہمیشہ شامل ہے۔ میں اس کے احسان کو بھلا نہیں سکتا۔

Marfat.com

میں ''چودھوی صدی'' قریباً چال سال تک چھاپتا رہا اور مسلسل خسارہ اٹھاتا رہا۔ آخر میری آمدنی کے تمام وسائل ''چودھوی صدی'' کے سمندر میں غرق ہو گئے اور میں نے اپنی شکست خود قبول کر لی۔ میں ہی نہیں ادبی دنیا کے تمام لکھنے والے حیران ہوتے ہیں کہ اظہر جاوید گزشتہ قریباً چالیس سال سے ''تخلیق'' کس طرح شائع کر رہا ہے۔ قریباً دو صد ضخامت کا رسالہ پابندی وقت کے ساتھ میرے پاس اور دیگر کے بیشتر ادیبوں کے پاس پہنچ جاتا ہے اور حد یہ ہے کہ اظہر جاوید نے اس رسالے کے ادارے (اپنی بات) میں کبھی اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر بھی نہیں کیا اور یہ فکر بھی نہیں کیا کہ محکمہ ڈاک نے اندرون و بیرون پاکستان رسالہ بھیجنے کی شرح یک دم بڑھا کر ترسیل ناممکن بنا دی ہے۔ اظہر جاوید نے نہ صرف اسے قبول کر لیا ہے بلکہ وہ لکھنے والی خاص خاص خواتین کو رسالہ تخلیق کوریئر سے بھیجنے لگے ہیں۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ گزشتہ چالیس برس سے ''تخلیق'' کی اشاعت کو برقرار رکھنے کے لئے کیسے کیسے پاپڑ بیل رہا ہے۔ کتنی جسمانی اور روحانی مشکلات اٹھا رہا ہے۔ اس مشکلات میں ہی اس کے دل نے دو مرتبہ احتجاج کیا اور صحت مند انداز میں دھڑکنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹروں نے بروقت مسیحائی کی اور اس کے دل کو عدم تعاون سے روک دیا۔ لیکن شرط لگا دی کہ وہ اب مشقت کے کام نہیں کریں گے۔ لیکن اگلے روز وہ دفتر ''تخلیق'' میں کتابت شدہ مضامین کی پروف ریڈنگ کر رہے تھے پرچہ وقت پر شائع ہوا۔ ان کی بیماری کی خبر اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین فخر زمان کو ہو گئی۔ انہوں نے سرکاری فنڈز سے مدد کرنے کی کوشش کی لیکن اظہر جاوید نے صاف انکار کر دیا۔

اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ اظہر جاوید زمانے کی بے مہری پر پریشان نہیں ہوتا۔ دوستوں اور وقت کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے کام آنے کی بیماری تو اسے شدت سے لاحق ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں جمہوریت کی ایک قرارداد پر دستخط کرنے کی وجہ سے اسے نوکری سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ دفتر امروز سے دفتر تخلیق میں آیا تو سب سے پہلے سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس نے ایک آمر کے خلاف قرارداد پر دستخط کئے تھے لیکن اسے افسوس اس وقت

Marfat.com

ہوا جب جمہوریت کا زیادہ ڈنکا بجانے والے دفتر ''امروز'' میں اپنی نوکریاں بچانے میں نہ صرف کامیاب ہو گئے بلکہ ان صحافیوں کے خلاف بھی ہو گئے جنہوں نے اس قرارداد پر دستخط کرنے کی جسارت کی تھی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو پہلی جلاوطنی سے واپس آئیں تو یہ ضیاء الحق کا دور تھا۔ لاہور میں کوئی ان کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ بڑے بڑے پپلیئے ادھر ادھر ہو گئے۔ ان کے جلسے کا اہتمام اظہر جاوید نے کیا۔ یہ اقدام گویا آمر ضیاء الحق سے اپنی برطرفی کا انتقام تھا لیکن دکھ انہیں اس وقت محسوس ہوا جب ''محترمہ دختر مشرق'' اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھ گئیں اور ان کے دائیں بائیں وہ لوگ تھے جو شریک سفر نہیں تھے۔ دوسری طرف اظہر جاوید کا حال یہ تھا کہ محترمہ کی شہادت کے بعد شہید بے نظیر بھٹو پر ایک کتاب شائع کی، جو اخباری تراشوں سے پاک خود ان کے قلم کا نتیجہ تھی۔

اظہر جاوید لاہور کا وہ منفرد ادیب ہے جس نے ملک کے نامور ادیب احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے ادبی تصادم میں غیر جانبداری کو فوقیت دی اور دونوں سے اپنی نیازمندی قائم رکھی۔ دونوں کی تخلیقات ''تخلیق'' میں شائع کیں اور جب صدر جنرل پرویز مشرف گورنر ہاؤس میں صحافیوں کی قطار میں قاسمی صاحب سے رسمی طور پر ہاتھ ملا کر آگے بڑھ گیا تو اس بے اعتنائی پر ''تخلیق'' میں اداریہ لکھا۔ قاسمی صاحب کی گرد و پیش میں بیٹھنے والوں نے اس کا کچھ اور مطلب نکالا اور معاملہ عدالت تک لے گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا..... سب کو معلوم ہے۔ میں نے ''تخلیق'' میں پڑھا کہ اظہر جاوید قاسمی صاحب کے مزار پر موم بتیاں روشن کرتا ہے تو میں نے لاہور کے ادیبوں سے پوچھا۔

''یہ اظہر جاوید کس مٹی کا بنا ہوا ہے''!

مجھے اس سوال کا جواب ابھی تک نہیں ملا۔

Marfat.com

اعتبار ساجد

اعتبار ساجد اردو ادب میں استقلال اور مسلسل محنت کی مثال ہیں۔ میں نے انہیں جب بھی دیکھا کتاب در بغل اور نئی کتاب کا مسودہ در دست ہی دیکھا اور میں یہ فیصلہ نہ کر سکتا کہ وہ پڑھتے زیادہ ہیں یا لکھتے زیادہ ہیں۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ انہوں نے اپنی بسیار نویسی کو اپنے معیار پر غالب نہیں آنے دیا، ان کی ہر کتاب معیار کے لحاظ سے ان کے ارتقاء کا اگلا قدم ہوتی ہے اور مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرزا غالب کے اس مصرعے کا تعاقب کر رہے ہیں:

''ہے کہاں تمنا کا آخری قدم یا رب؟''

اور تمنا کی منزل کی تلاش میں کتابوں کے انبار لگائے چلے جا رہے ہیں اور اپنے قارئین کے ذہنی افق کو وسیع کرنے میں مصروف عمل ہیں۔

اعتبار ساجد اولیاؤں کی سرزمین ملتان میں پیدا ہوئے، ان کا پورا نام سید اعتبار حسین ہے۔ ادب کی دنیا میں آئے تو خود اپنا نام اعتبار ساجد تجویز کیا۔ نمود و نمائش کے ابتداء سے ہی مخالف تھے اور حد یہ کہ انہوں نے اپنے ''سید'' ہونے کا اعلان بھی اونچی آواز میں کبھی نہیں کیا حالاں کہ وہ نجیب الطرفین سادات میں سے ہیں اور اپنے نام کے ساتھ ''سید'' لکھنے کا نسبی حق

Marfat.com

انہیں حاصل ہے۔

اعتبار ساجد نے ''گرد، گرما، گداو گورستان'' کی اس فضا میں پرورش پائی جس میں ایثار اور قربانی کی فراوانی تھی اور خلقِ خدا کی رہنمائی کو فرض عین سمجھا جاتا تھا۔ اعتبار ساجد نے بھی ایم اے اردو بدرجہ اول کرنے کے بعد تعلیم و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور ملازمت کے لئے بلوچستان کے پسماندہ صوبے میں نوشکی کو منتخب کیا۔ پھر بلوچستان کی سیاسی فضا میں تبدیلی آ گئی اور اس فرزندِ ملتان کو بلوچستان چھوڑنا پڑا۔ اب انہیں اسلام آباد کے فیڈرل کالج میں جگہ دی گئی۔ لیکن بلوچستان کی یادیں اب تک ان کی دامن گیر ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام آباد کی مٹی میں ان کی شخصیت کی جڑیں اتر نہ سکیں اور ساٹھ سال کی عمر عبور کرنے پر ریٹائر ہوئے تو اس شہر کو چھوڑ کر لاہور آ گئے جو پاکستان کا تہذیبی مرکز اور علم و ادب کا گہوارہ ہے۔

اعتبار ساجد کو ادب کا شوق اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بچوں کے رسالہ ''تعلیم و تربیت'' لاہور میں اصلاحی کہانیوں سے آغاز کیا، اس ابتدائی مشق کے بعد وہ نہ صرف افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے بلکہ شاعری بھی کرنے لگے اور زندگی کو مزاح نگار کی آنکھ سے دیکھنے اور ناہمواریوں کو شگفتہ بیانی سے پیش کرنے میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ اردو نثر میں ان کی دو درجن کتابیں اور شاعری کے اٹھارہ مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ان کے مضامین قومی اور بین الاقوامی رسائل میں کثرت سے چھپتے ہیں اور ان کو ایک ایسا مصنف سمجھا جاتا ہے جس کا ہر رنگ اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے افسانے میں معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ شاعری ان کے اپنے باطن کی آواز ہے اور طنز و مزاح وہ ردعمل ہے جو زمانہ اپنی حماقتوں سے ان کے دل میں پیدا کرتا ہے۔

اعتبار ساجد سلسلہ در سلسلہ لکھنے والے قلم کار ہیں۔ ان کی ایک کہانی جہاں ختم ہوتی ہے وہیں سے دوسری کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ ''راجو کی سرگزشت'' اور ''سیلاب'' کے نام سے چھپنے والے ان کے ناول بچوں میں بہت مقبول ہوئے تھے لیکن آپ سن کو حیران ہوں گے کہ ان ناولوں

Marfat.com

کو بڑی عمر کے لوگوں نے بھی بہت پسند کیا ہے۔ ایک بزرگ مقبول اکیڈمی کے شو روم پر اعتبار ساجد کا ایک ناول خریدنے آئے تو میں سمجھا کہ اپنے پوتے پوتیوں کے لئے کتاب خریدنا چاہتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے ''اعتبار ساجد میرا محبوب مصنف ہے۔ اسے پڑھ کر میں اپنے بچپن سے ملاقات کر لیتا ہوں''۔

یہ مرتبہ بہت کم ادیبوں کو حاصل ہوا ہے' کہ بچے' جوان اور بوڑھے اسے یکساں دلچسپی سے پڑھتے ہوں۔

ان کے مزاج میں بظاہر سیدھی لکیر پر چلنے کا اندازہ نمایاں ہے' لیکن ان کی کتابیں ''قصہ پانچویں درویش کا'' ..... ''انگور کھٹے ہیں'' ..... ''کارستانیاں'' ..... ''آپ کا نیازمند'' اور ''یہ عالم شوق کا'' پڑھیں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ سیدھی لکیر پر بھی مسکراہٹوں کے شگوفے کھلاتے چلے جا رہے ہیں۔ ''اس طرح ہوتا ہے'' کو ایک نقاد نے اردو کا پہلا مزاحیہ رپورتاژ قرار دیا ہے۔ ''قلم کاریاں'' ان کے کالموں کی اور ''تفہیم ادب'' ان کی تخلیقی تنقید کی کتابیں ہیں۔ ''ندائے ملت'' سیاسی ہفت روزہ ہے لیکن میں یہ رسالہ اعتبار ساجد کا کالم ''ہم لوگ'' پڑھنے کے لئے خریدتا ہوں۔ وہ زندگی کو مسکرا کر دیکھتے ہیں تو ان کے ساتھ پوری کائنات مسکرانے لگتی ہے۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک خاص قسم کا سحر ہے جو بہت دلاویز ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید سے میں اس وقت سے غائبانہ طور پر واقف ہوں جب ان کے افسانے رسالہ ''بیسویں صدی'' میں چھپتے تھے۔ میں نے اپنا رسالہ ''چودھویں صدی'' لاہور سے جاری کیا تو انہیں لکھنے کی دعوت دینے کے لئے تلاش کیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ محکمہ نہر پنجاب میں میانوالی کے صحراؤں میں انجینئرنگ کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور افسانے سے ان کی دلچسپی کم ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ۱۹۶۶ء میں ''اوراق'' جاری کیا تو ڈاکٹر انور سدید نقاد کی حیثیت میں نمودار ہوئے لیکن اس وقت بھی وہ لاہور سے دُور کہیں محکمانہ خدمات انجام دے رہے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے کرائی۔ اظہر صاحب ڈاکٹر انور سدید کا بھارت کا سفرنامہ ''دلی دور نہیں'' تخلیق میں قسط وار چھاپ رہے تھے۔ اچانک ایک دن انہیں خیال آیا کہ یہ سفرنامہ اب کتاب کی صورت میں پیش کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ وہ انور سدید صاحب کو اپنے ساتھ مقبول اکیڈمی پر لے آئے اور آتے ہی ''دلی دور نہیں'' کا مسودہ میز پر رکھتے ہوئے کہا ''ملک صاحب! یہ کتاب اپنے ادارے سے چھاپ دیجئے''۔ اب اظہر جاوید ایسے دوست ہیں جن کے ذوق پر میں نے ہمیشہ انحصار کیا ہے اور ان کے حکم کی تعمیل میں کبھی تاخیر نہیں کی۔ میں نے ان سے مسودہ لے کر کاتب کو آواز دی کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس

Marfat.com

مسودے کی کتابت کرے۔

ڈاکٹر انور سدید سے یہ ملاقات مختصر نہیں تھی بلکہ اتنی طویل تھی کہ کئی برسوں پر پھیل گئی اور آج تک جاری ہے۔اس دوران میں نے ان کی متعدد کتابیں .....''برسبیل تنقید''.....انیس کی قلمرو.....''زندہ لوگ''.....''دلاور فگاریاں''.....''اردو نثر کے آفاق''.....''شاعری کا دیار.....خطوط کے آئینے میں''.....''ادب در ادب''.....''پرندہ سفر میں''.....''ایک صدی کے افسانے'' وغیرہ شائع کیں اور ان سے محبت کا تعلق ایسا بڑھا کہ درمیان سے من وتو کا رشتہ بے معنی ہو گیا۔میں نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی ایک کتاب ہر سال مقبول اکیڈمی سے شائع ہو گی۔میں اس وعدے کی تعمیل اب تک کر رہا ہوں۔ اسی دوران کئی لوگوں نے مجھے کہا کہ انور سدید وزیر آغا گروپ کا آدمی ہے اور متنازعہ ادیب ہے لیکن میں نے ملاقاتوں میں محسوس کیا کہ وہ گروپ باز نہیں بلکہ تعلقات قائم رکھنے والے ادیب ہیں اور دشمنوں سے بھی دوستی کرتے ہیں۔اس کی مثال یہ ہے کہ وہ وزیر آغا کی طرح جناب احمد ندیم قاسمی کو بھی اپنا محسن تسلیم کرتے ہیں اور اس کا اظہار لکھ کر بھی کرتے ہیں۔ان کی برسی اور سالگرہ پر مضامین لکھتے ہیں۔اب ذرا ان کے حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں جو مسلسل جدوجہد کی ایک عمدہ و اعلیٰ مثال ہے۔

ڈاکٹر انور سدید ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کو ضلع سرگودھا کے ایک دور افتادہ مقام میانی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ خان میں حاصل کی' وہ بنیادی طور پر ادب کے طالب علم تھے اور تعلیم کے ابتدائی زمانہ میں ہی بچوں کے رسائل میں کہانیاں لکھنے لگے تھے۔لیکن انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو ان کے بڑے بھائی میاں معراج الدین نے انہیں انجینئر بنانے کا منصوبہ بنایا اور انہیں سائنس کے مضامین اختیار کرائے۔ اسلامیہ کالج کی تحریکی فضا میں وہ ایف،ایس،سی کا کورس مکمل نہ کر سکے۔اس وقت تحریک پاکستان عروج پر تھی اور اسلامیہ کالج کے طلباء اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔اس تحریک میں شمولیت کی وجہ

Marfat.com

سے انہوں نے امتحان میں شرکت نہ کی۔ کیونکہ ''تھرڈ ڈویژن'' لینا انہیں گوارہ نہ تھا۔ اس دور میں انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور محکمہ آبپاشی کی ملازمت اختیار کی ماہانہ تنخواہ ۳۵ روپے تھی۔ یہاں نا آسودگی محسوس کی تو وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ انجینئرنگ سکول رسول (ضلع گجرات) میں داخل ہو گئے۔ یہاں اسلامیہ کالج کی سائنس کی تعلیم کام آئی اور آخری امتحان اعزاز خاص کے ساتھ اول بدرجہ اول رہ کر پاس کیا اور طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔

انور سدید ۱۹۵۰ء میں محکمہ آبپاشی میں سب انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے تو یہاں بھی ترقی کا دروازہ بند پایا اور نا آسودگی محسوس کرنے لگے۔ اس بند دروازے کو کھولنے کے لئے انہوں نے دو محکمانہ امتحان پاس کرنے کے علاوہ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) سے پی ایس سی کی سطح کے ''اے' ایم' آئی' ای'' کے امتحانات میں کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۹۶۱ء میں ایس ڈی او کے عہدے پر ترقی پائی اور ۱۹۷۷ء میں ایگزیکٹو انجینئر بن گئے۔ ساٹھ برس کی معینہ عمر تک پہنچنے پر ریٹائر ہوئے تو وہ سپرنٹنڈنگ انجینئر کے گریڈ ۱۹ میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک پیشہ ور انجینئر کی حیثیت میں انہوں نے اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران انور سدید نے ادب کے ساتھ اپنا ناطہ قائم رکھا۔ ادیب فاضل میں پنجاب یونیورسٹی میں اولیت بدرجہ اول حاصل کی' ایف اے' اور بی اے کے امتحانات صرف انگریزی میں پاس کئے۔ ایم اے میں بھی پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے اول بدرجہ اول اور دو طلائی تمغوں سے کامیابی پائی۔ ۱۹۷۸ء میں ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے داخلی رہنما ڈاکٹر وزیر آغا اور ممتحن ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر شمس الدین صدیقی تھے۔ اس کتاب پر انہیں ہجرہ ایوارڈ دیا گیا۔ ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' پر گلڈ ایوارڈ' مقالہ ''اردو میں حج ناموں کی روایت'' پر نقوش ایوارڈ اور بہترین کالم نگاری پر ''اے پی این' ایس'' ایوارڈ بھی انہیں مل چکا ہے۔ انور سدید متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ ان کی کتابیں ''اردو ادب میں سفرنامہ'' ''اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش'' ''اُردو ادب کی تحریکیں..... ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' اولیات کا درجہ رکھتی ہیں اور کالج اور یونیورسٹی کے طلباء کے

Marfat.com

علاوہ اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے میں شریک ہونے والوں کی معاونت بھی کرتی ہے۔

اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کو پاکستانی ادب کے معماروں میں شامل کیا ہے۔ انور سدید کے فن اور شخصیت پر سجاد نقوی نے ایک کتاب ''گرم دم جستجو'' شائع کی۔ رسالہ تخلیق، اوراق، جدید ادب، ارتکاد، کوہسار، روشنائی، ماہنامہ قرطاس اور چہارسو، میں ان پر گوشے چھپ چکے ہیں ۸۲ برس کی عمر میں بھی وہ جوانوں سے زیادہ کام کر رہے ہیں اور ان کا قلم تیز گام ہے۔

انور سدید کے چار بیٹے ہیں' ان میں سے دو ڈاکٹر اور دو انجینئر ہیں' ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ''.....''زندگی''.....روزنامہ ''خبریں'' کے بعد وہ روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ساتھ وابستہ ہیں وہ مجید نظامی صاحب کے اس قول کی مثال ہیں کہ ''مصنف اور صحافی زندگی کے آخری لمحے تک لکھتا رہتا ہے''۔

ڈاکٹر انور سدید قلم کے شاہسوار ہیں' ان کے شب و روز پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتے ہیں ڈاکٹر صاحب بلاشبہ اردو ادب میں ایک اہم اور قد آور شخصیت ہیں۔ نجم الحسن کراچی سے اظہر جاوید کے رسالہ ''تخلیق'' میں رقمطراز ہیں۔

> ''انور سدید صاحب کا تخلیقی وفور قیامت خیز ہے' کرکٹ میں اچھے بلے بازوں کو رنز بنانے کی مشین کہا جاتا ہے۔ انور سدید صاحب نے لفظوں کی ایسی مشین ایجاد کی ہے جس میں طرح طرح کے ہرے' نیلے' پیلے اور لال بٹن لگے ہیں وہ ضرورت کے مطابق بٹن دباتے ہیں اور کھٹ سے دوسری طرف سے کوئی مقالہ' کتابوں پر تبصرہ' سالانہ ادبی جائزہ' کسی ادیب کا برسی نامہ' غزل' انشائیہ' مدیر تخلیق کے نام خط نکل آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑا زرخیز ذہن دیا ہے اگر وہ نہ ہوتے تو ''تخلیق'' کا پیٹ بھرنے کے لئے مزید آدھے درجن قلم کاروں کے تعاون کی ضرورت پڑتی''۔

بے شک اگر کسی نابغۂ عصر ہستی نے سب سے زیادہ تاریخ ساز' بے مثال اور یادگار

Marfat.com

کارکردگی کا تخلیقی اور تنقیدی سطح پر اظہار کیا ہے تو وہ صرف اور صرف ڈاکٹر انور سدید کی ذات باصفات ہے۔ اپنی چون سالہ اشاعتی زندگی میں میرا صرف دو ہمہ جہت قلم کاروں سے واسطہ پڑا ہے۔ ایک سید رئیس احمد جعفری تھے اور دوسرے ڈاکٹر انور سدید۔ ان دو ادیبوں نے بہت زیادہ لکھنے کے باوجود اپنا معیار قائم رکھا ہے۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید دریا دل انسان ہیں' انہیں کسی ستائش اور صلے کی تمنا نہیں' اردو ادب کی خدمت ان کا مشن ہے اور وہ انتھک محنت کے ذریعے ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے تا کہ وہ مزید ادبی اور تخلیقی کام کر سکیں۔ (آمین)

Marfat.com

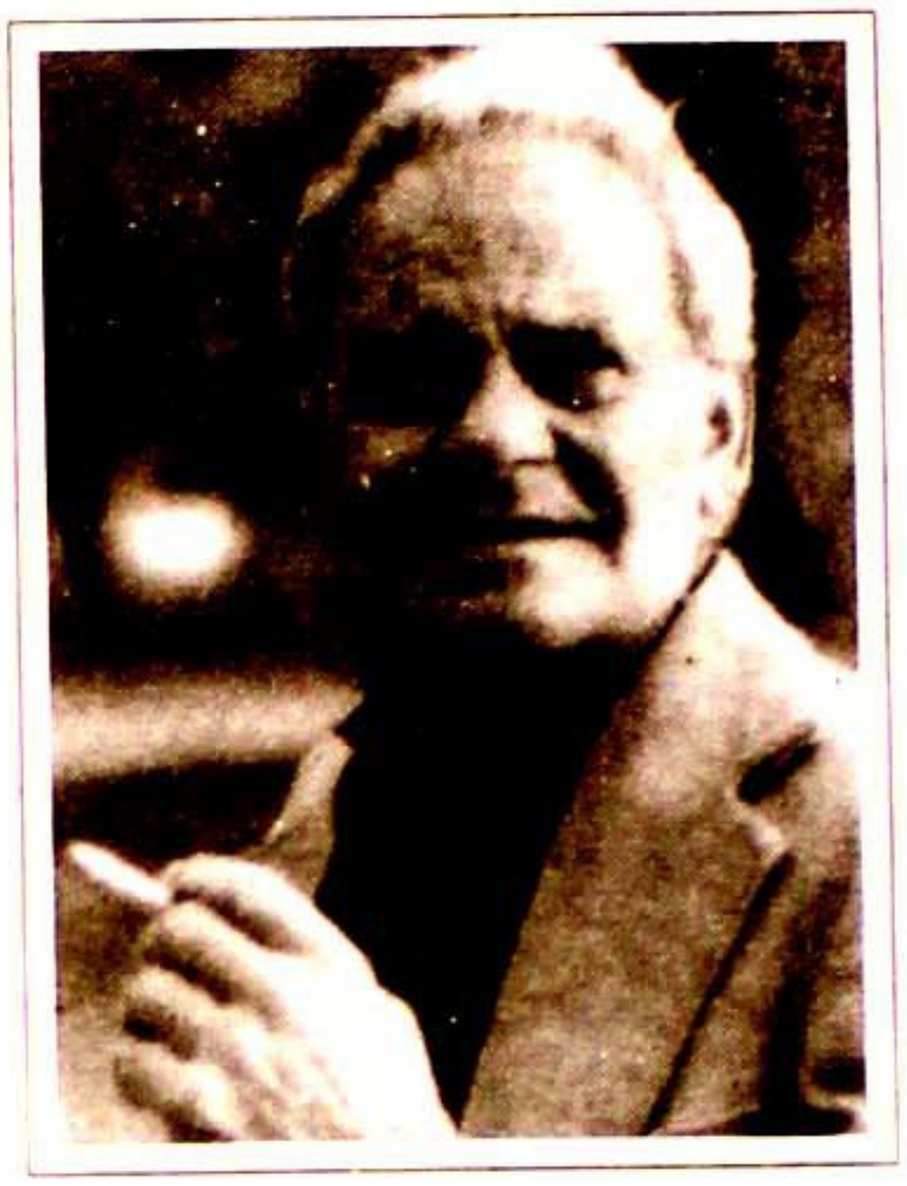

اے حمید

اے حمید سے میری پہلی ملاقات کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے اس نامور ناول نگار سے میری پہلی ملاقات ابھی ختم نہیں ہوئی' ہمارے درمیان باتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ بلاشبہ وہ تخلیق کار ہیں اور میں ان کی کتابوں کا ناشر ہوں لیکن ہمارے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ محبت کا ہے اور یہ ایسی محبت ہے جو پہلی نظر میں ہی ہو جاتی ہے اور پھر ساری عمر اپنا جادو پھیلاتی رہتی ہے اور دوسرا بندہ اس جادو کے اثر سے اس کی محبت میں گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔

اے حمید امرتسر جیسے خوبصورت شہر سے ۱۹۴۷ء کے بعد لٹ پٹ کر آیا تھا۔ اب تو کسی کو معلوم نہیں کہ اس نے تحریک پاکستان کو امرتسر میں کس طرح کامیاب بنایا تھا لیکن یہ تمام داستانیں جو امرتسر کی گلیوں میں خون سے لکھی گئی تھیں' وہ اپنے دل میں سمیٹ کر لاہور آ گیا تھا اور یہاں آ کر اس نے افسانہ ''منزل منزل'' لکھا تھا جو چھپتے ہی مقبول ہو گیا۔ اس میں امرتسر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ کوئی تاریخ دان بھی پیش نہیں کر سکتا۔ یہ افسانہ امرتسر کی تہذیبی اور رومانی زندگی کا خوبصورت نقش ہے اور اسے پڑھتے ہی میں نے اے حمید سے ملاقات کی ٹھان لی تھی۔ اے حمید

Marfat.com

سے یہ ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب میرا رسالہ ''چودھویں صدی'' کا تجربہ ناکام ہو چکا تھا۔ رسالہ مفت پڑھنے والوں نے ہی نہیں' بک سٹال کے اخبار فروشوں نے بھی مجھے شدید مالی نقصان پہنچایا تھا۔اس وقت رئیس احمد جعفری کے ساتھ جس ادیب نے میرے ساتھ تعاون کیا اور مجھے کامیابی کا راستہ دکھایا ان میں اے حمید بھی شامل ہے۔ میں جب اس سے ملنے اس کے گھر پر گیا تو ایک خوش شکل نوجوان نے دستک کی آواز سن کر دروازہ کھولا، جو لڑکا سامنے کھڑا تھا میں نے اسے اے حمید کا بیٹا سمجھا۔ میرے تصور میں جو اے حمید تھا وہ ایک ادھیڑ عمر کا انسان تھا جس کی کنپٹی پر سفید بال نکل آئے تھے اور سر کے عین درمیان میں سے بال اڑ چکے تھے اور سرفٹ بال نظر آتا تھا لیکن اب جو لڑکا میرے سامنے تھا وہ ایک خوبصورت جوان رعنا تھا۔ میں نے کہا..... ''بیٹا! اے حمید صاحب سے کہو مقبول احمد ملنے کے لئے آیا ہے''۔

اب اس لڑکے نے مجھے ملک صاحب کہہ کر بلایا اور کہا ''میں ہی اے حمید ہوں''..... میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

اب میں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اے حمید اردو کے ان مصنفین میں سے ہے جس نے مقبول اکیڈمی کے اشاعتی پروگرام کی سب سے زیادہ معاونت کی اور اس کے ابتدائی دور میں جب اسے کئی اقسام کی مشکلات کا سامنا تھا بے لوث مدد کی۔ میں نے اس سے اپنی ملاقات کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ ایک طویل ملاقات کہا ہے تو یہ بھی غلط نہیں ہے کیوں کہ اے حمید مقبول اکیڈمی کا صرف قلمی معاون نہیں ہے بلکہ خود مقبول اکیڈمی ہے۔ میں اُسے ''من تو شدم تو من شدی'' کی مثال سمجھتا ہوں۔ اس کی سرپرستی پر فخر ہے تو وہ بھی اپنی کتابوں کو مقبول اکیڈمی سے شائع کرانے کو ترجیح دیتا ہے۔

اے حمید اردو افسانے کا ایک بڑا نام ہے۔ مجھے اس کی وہ تصویر یاد آ رہی ہے جو ''نقوش'' کے افسانہ نمبر میں چھپی تھی اور جس میں وہ سعادت حسن منٹو' اشفاق احمد' شوکت تھانوی جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ ان کے برابر نظر آتا تھا۔ پہلے تین افسانہ نگار تو

Marfat.com

مجھے لشکارے مارتے نظر آئے لیکن اے حمید مجھے زمین کے ساتھ چمٹا ہوا انسان نظر آیا جو اوپر نظر اٹھا کر دیکھنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں آسمان ٹوٹ نہ پڑے۔ میں نے اس کی وجہ یہ سمجھی کہ اے حمید نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں امرتسر کو آگ کے الاؤ میں جلتا ہوا دیکھا تھا۔ یہ منظر اس کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ بے شک اس نے دنیا دیکھی ہے اور بہت سے شہر اپنے تہذیبی نقوش کے ساتھ اس کے افسانوں میں موجود ہیں۔ اس کا مزاج بھی رومانی ہے۔ وہ جمالیات پرست ہے۔ لیکن اس کی جمال پسندی میں اس خون کی آلودگی بھی موجود ہے جو امرتسر کے فرقہ پرستوں نے بہایا تھا اور جس سے جان بچا کر اے حمید لاہور آ گیا تھا۔

اے حمید کے افسانوں کا بنیادی موضوع محبت ہے اور یہ محبت ایک خوشبودار کلی کی طرح اس کے دل سے اُگی ہے اور اپنی خوشبو ہر طرف بکھیر رہی ہے۔ اس خوشبو کا پہرہ دار جب سماج بن جاتا ہے تو اے حمید اداس ہو جاتا ہے۔ میں کبھی اس کے گھر جاؤں اور اسے اداس دیکھوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ وہ کوئی بڑا ناول تخلیق کر رہا ہے۔ پھر میں خاموشی سے واپس آ جاتا ہوں۔

اے حمید اکھڑ ادیب نہیں وہ سلسلہ در سلسلہ اور منزل در منزل ادیب ہے، ایک ناول ختم کرتا ہے تو اس کے اختتام سے ایک نیا ناول شروع ہو جاتا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ''بھارت کے فرعون'' نو حصوں پر ''کشمیر کے شاہین'' تین حصوں پر وطن کے سرفروش پانچ حصوں پر ''کمانڈو'' سات حصوں پر مشتمل ناول ہیں۔ مقبول اکیڈمی نے اس کے پچاس سے زائد ناول شائع کئے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ اردو کا سب سے مقبول مصنف ہے۔ اس کو لڑکے بالے سب پڑھتے ہیں حتیٰ کہ میں نے بڑے بوڑھوں کو بھی اس کے ناول خریدتے ہوئے دیکھا ہے۔ کالج کی لڑکیاں اس کے ناولوں کی خاصی خریدار ہیں۔ ایک زمانے میں خریدار ''وہی وہانوں'' کے ناول چھپا کے لے جاتے تھے لیکن اے حمید قدروں کا طرف دار مصنف ہے، لڑکیاں ان کے ناول پڑھتی ہیں تو ان کے ماں باپ اعتراض نہیں کرتے حالاں کہ وہ راشد الخیری کے انداز میں اصلاحی ناول نگار نہیں لیکن اخلاقیات کا تحفظ اس کا ضابطہ ہے جس کی پابندی وہ سلیقے سے کرتا ہے۔

Marfat.com

اے حمید کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ۱۹۹۷ء میں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' عطا کیا تھا لیکن وہ کہنے لگا مجھے اپنے قارئین نے سب سے بڑا تمغہ بہت پہلے عطا کر دیا تھا اور عوام کی رائے کو اپنا سب سے بڑا انعام سمجھتا ہوں۔

مجھے فخر ہے کہ اے حمید میرا دوست ہے اور مقبول اکیڈمی کا معاون ہے۔ خدا ان کے قلم کو رواں دواں رکھے۔ وہ دکھی انسانیت میں محبتیں تقسیم کر رہا ہے۔

Marfat.com

پروفیسر تنویر حسین

پروفیسر تنویر حسین اردو مزاح نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو مشتاق احمد یوسفی کے بعد روتے بسورتے اور سیاست و معاشرت کے مارے ہوئے لوگوں کو ہنسانے اور زندگی کے مثبت عمل میں شریک کرنے کی ترغیب پر مامور کی گئی ہے۔ان کو دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی بم دھماکے سے جان بچا کر آئے ہیں، ان کی حالت دیکھ کر رحم تو آتا ہے لیکن یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے اندر مزاح کا چشمہ ابل رہا ہے اور وہ بم دھماکے سے پیدا ہونے والی سراسیمگی اور خوف سے بھی مزاح کو ابھار سکتے ہیں۔اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فطری مزاح نگار ہیں جو دکھ بھری زندگی کو دیکھ کر اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتے ہیں لیکن دوسروں کو مسکرانے کا موقع بھی دیتے ہیں۔

تنویر حسین خطۂ سیالکوٹ کے فرزند ہیں، علامہ اقبال زندہ ہوتے تو ان کو سید نذیر نیازی کی جگہ دیتے اور انہیں اپنے حلقۂ احباب میں شامل کر لیتے کیوں کہ نیازمندی کا جو اسلوب فطرت نے تنویر حسین کو دیا ہے وہ عہد اقبال کے لوگوں کو بھی شاید حاصل نہیں تھا۔ان کی پیدائش کا مقام تو ایک چھوٹا سا گاؤں کنگرہ ہے جو سرحد کے نواح میں واقع ہے اور میرے گاؤں سے تین چار کلومیٹر

Marfat.com

پر واقع ہے۔تنویر حسین اسی گاؤں میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے۔ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے قوم کے بچوں کو ادب پڑھانے کا پیشہ اختیار کیا اور گورنمنٹ کالج باغبانپورہ میں درس و تدریس کا فریضہ ادا کرنے لگے۔شومئے قسمت سے ان کی تبدیلی اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں ہوگئی جہاں ایک ایسا پرنسپل موجود تھا جو دوسروں کی سیدھی ناک کو ٹیڑھا کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا لیکن اپنی ٹیڑھی ناک کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے اساتذہ میں پرنسپل کی آمریت کے خلاف بغاوت کے جذبات پرورش پانے لگے۔تنویر حسین مرنجاں مرنج انسان تھے اور پرنسپل کی ٹیڑھی ناک کو سیدھا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن ''بغاوت'' کی آگ پھیلی تو وہ بھی دھر لئے گئے اور پرنسپل اور دیگر اساتذہ کی طرح انہیں بھی دھر لیا گیا اور انہیں بھی لاہور سے شیخوپورہ کے ایک کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔تنویر حسین نے اس موقع کو غنیمت جانا اور پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنا شروع کر دیا۔ان کی خوش نصیبی سے جب یہ مقالہ مکمل ہو گیا تو ان کا تبادلہ واپس لاہور کر دیا گیا۔اگلے روز مقبول اکیڈمی پر آئے تو خوش تھے کہ اب وہ بھی ڈاکٹر تنویر حسین کہلائیں گے۔

پروفیسر تنویر حسین زندگی کو ایک ہوش مند انسان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی بوالعجبیوں پر حیرت کا اظہار اپنے کالم میں کرتے ہیں جو پاکستان کے سب سے بڑے قومی اخبار ''نوائے وقت'' میں چھپتے ہیں تو لاکھوں لوگوں میں ان کی مسکراہٹیں تقسیم ہو جاتی ہیں اور تنویر حسین کی مزاح نگاری کا عمل نیکی کا عمل بن جاتا ہے'ان کے کالم مندرجہ ذیل تین کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔

۱۔مزاح بخیر ۲۔خوش آم دید ۳۔شاباش

''اصناف ادب اردو'' کے نام سے انہوں نے ایم اے'ایم فل کے طلباء کے لئے ایک رہنما کتاب مکمل کی جسے مقبول اکیڈمی نے شائع کیا اور غلام عباس کے افسانوں کا تجزیہ فکر و فن کے آئینے میں کیا ہے۔

پروفیسر تنویر حسین کتابوں کے شیدائی ہیں اور وہ اردو بازار کا ایک چکر روزانہ ضرور

Marfat.com

لگاتے ہیں۔ جب کبھی ادھر آئیں تو مقبول اکیڈمی پر بھی قدم رنجہ فرماتے ہیں اور پھر علم وادب طنز ومزاح اور حالات حاضرہ پر دو تین گھنٹے کی نشست تو معمولی بات ہے۔ انہیں ادبی معاشرے کے سب سیکنڈلوں کا علم ہوتا ہے لیکن شریف اتنے ہیں کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے اور سکینڈل کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جیسے اس کی تعریف کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان میں ابھی کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دوسروں کے کام کی تحسین خلوص دل سے کرتے ہیں اور ان سے اپنی تعریف کا تقاضا نہیں کرتے۔ بلاشبہ ان کی شرافت کا ہر کوئی مداح ہے اور ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شرافت کو اخباری اشتہار بننے نہیں دیا۔ پروفیسر تنویر حسین دوسروں کی عزت دل و جان سے کرتے ہیں اور اپنی عزت کرانے کا فن جانتے ہیں۔ زندہ باد پروفیسر تنویر حسین!

اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ (آمین)

Marfat.com

جبّار مرزا

جبّار مرزا عمر کے اعتبار سے مجھ سے چھوٹے ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں اتنی محنت کی ہے، اتنے تجربات سمیٹے ہیں اور اتنے بڑے بڑے لوگوں کی مجالس سے فیض اٹھایا ہے کہ میں ان کو ایک بڑا آدمی اور بڑا انسان تسلیم کرتا ہوں اور ان کو جھک کر ملتا ہوں اور اب آپ کو یہ بات بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جبار مرزا سچے اور خالص ادیب ہیں، دنیاداری انہیں نہیں آتی۔ درویشی ان کی صفت ہے۔ مزاج کے غنی ہیں۔ سونے کے گلاس کو ٹھکرا کر مٹی کے پیالے میں پانی پیتے ہیں۔ شاعری کرتے ہیں۔ افسانہ لکھتے ہیں۔ کالم نگاروں سے محبت کرتے ہیں۔ صحافت کے ساتھ ادب سے بھی انہیں عشق ہے۔ اب تک اتنی کتابیں شائع کر چکے ہیں کہ ان کے نام گنوائے نہیں جا سکتے۔

جبار مرزا ادب و صحافت کا ذوق لے کر یکم اکتوبر 1948ء کو اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔ جو اس زمانے میں راولپنڈی کے ایک محلے کا نام تھا۔ ان کے والد کا نام بدرالدین ہے۔ وہ برٹش آرمی کے محکمہ سپلائی میں صوبیدار تھے۔ اپنے فرائض اتنی دیانتداری سے ادا کرتے تھے کہ 1946ء میں ریٹائر ہوئے تو انہیں دو مربعہ اراضی ضلع رحیم یار خان میں

Marfat.com

انعام دی گئی اور برما کے محاذ پر اعلیٰ خدمات انجام دینے پر ایوارڈ دیا گیا۔ جبار مرزا کی طبیعت نے زمینداروں کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے ہل کی بجائے قلم تھام لیا۔ ابتدائی تعلیم راولپنڈی میں چک لالہ کے سی بی اے سکول سے حاصل کی اور ایم اے اردو 1976ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ قلم و قرطاس کی محبت شروع سے دل میں پرورش پانے لگی تھی۔ شورش کاشمیری ان کی تحریروں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اسلام آباد میں ''چٹان'' کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر بنا دیا۔ یہ تجربہ اتنا سود مند ثابت ہوا کہ ان کے قلم کے گھوڑے ادب کے ہر میدان میں فتوحات حاصل کرنے لگے۔ اسلام آباد کے معروف اخبار ''مرکز'' کی تین سال تک ادارت کی۔ اسی دوران ماہنامہ ''افتخار ایشیاء''، اخبار ''مسلمان''، ماہنامہ ''الکشمیر''، ماہنامہ ''مواصلات''، ماہنامہ ''بیسویں صدی'' اور کئی دیگر رسائل و اخبارات کی ادارت کی۔ متعدد نئے لکھنے والوں کو ادب کے آسمان کا تابندہ ستارہ بنایا۔ سینئر ادیبوں کی مودبانہ پذیرائی کی۔ اچانک خیال آیا کہ زندگی کرنے کے لیے محض قلمکاری کافی نہیں۔ یہ خیال آتے ہی بوہڑ بازار راولپنڈی میں ''ابن مریم میڈیسن'' نام سے ادویات کا تھوک کاروبار کرنے لگے۔ یہ شعر اسی زمانے میں کہا:

زندگی سوداگروں کے درمیاں
کٹ رہی ہے گرچہ سرمایہ نہیں

سوداگروں کے درمیان دل نہ لگا تو واپس شاعری اور ادیبوں سے آ ملے۔ ضمیر جعفری، کرنل محمد خان، کرنل غلام سرور، ڈاکٹر عبدالقدیر خان، رئیس امروہوی، ڈاکٹر بشیر الدین محمود، افتخار عارف، خاطر غزنوی، فرخندہ لودھی، انور مسعود، پریشان خٹک اور احمد ظفر جیسے نامور ادیبوں نے ان پر مضامین لکھے۔ جبار مرزا کی شاعری کے دو مجموعے ''مرحلے'' اور ''فاصلے'' کے عنوانات سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے اخباری کالموں کے تین مجموعے شائع ہو چکے

Marfat.com

ہیں لیکن وہ ''چھوٹے لوگ'' کو اپنی مقبول ترین کتاب شمار کرتے ہیں۔ جس پر سیالکوٹ کے شہریوں نے انہیں ''آزادی شیلڈ'' پیش کی۔ ''ضیاء دور فضل حق کی نظر میں'' سیاسی نوعیت کی کتاب ہے۔ ''میں اور تو'' میں وہ مکالمات شامل ہیں جو جبار مرزا بھارت اور پاکستان کے اہل قلم سے کیے۔ گزشتہ سات سال سے وہ جس کتاب پر کام کر رہے ہیں اس کا نام ''مزاح نگاروں کا کمانڈر انچیف..... سید ضمیر جعفری'' ہے۔

جبار مرزا کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے کامرانیوں کا ذکر فراوانی سے کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ انہوں نے کامیابی کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو اپنی کلائی سے مروڑا اور ان کا رخ کامرانی کی طرف موڑ دیا اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ میں انہیں اس دنیا کا ایک کامیاب انسان سمجھتا ہوں لیکن وہ خود گلہ مند ہیں کہ:

غم حیات سے فرصت نہ مل سکی مرزا
وگرنہ شہر سخن کا میں تاجور ہوتا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ شہر سخن کے تاجدار ہیں ان کے عہد نے ان کی پوری قدر شناسی کی ہے۔ ان کی خدمت میں بے شمار ایوارڈ پیش کیے ہیں۔ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ''

☆☆☆

Marfat.com

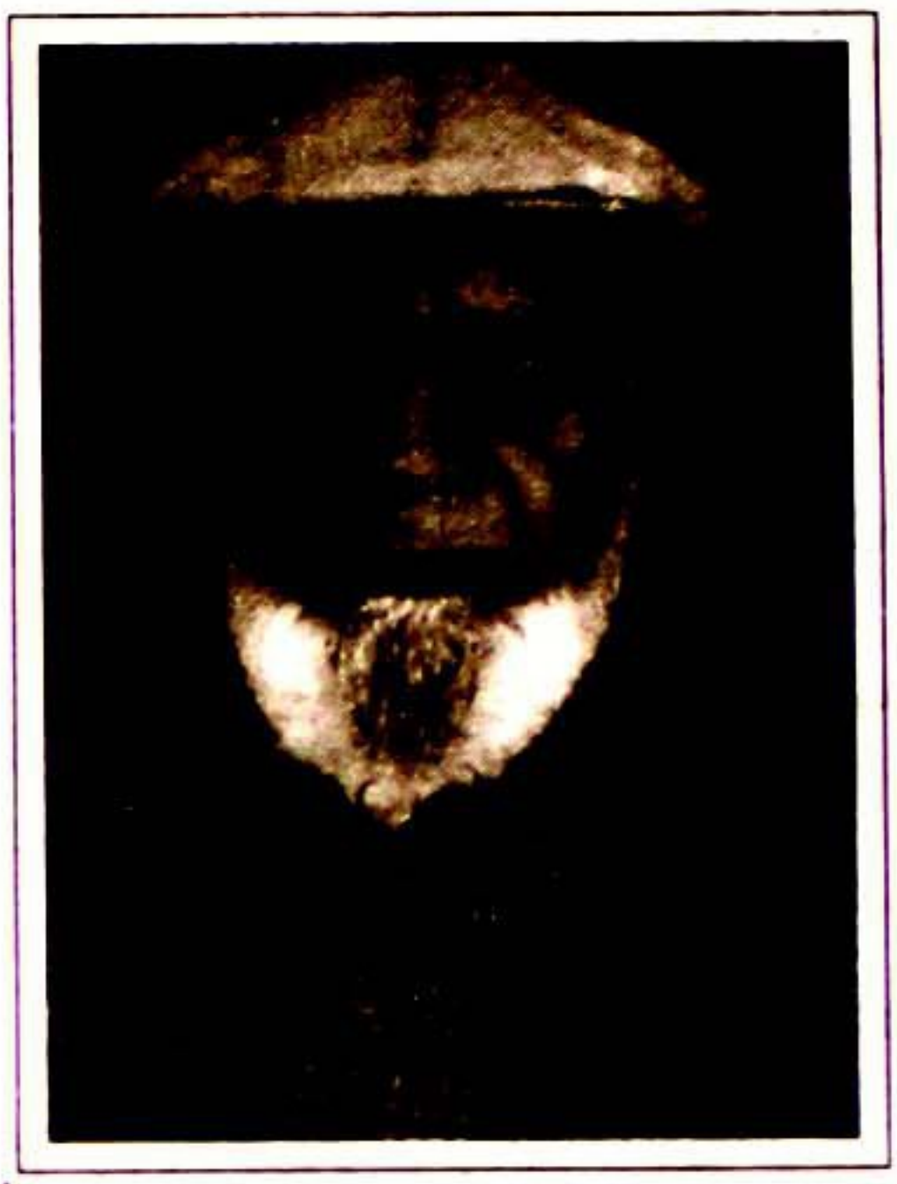

پروفیسر جمیل آذر

پروفیسر جمیل آذر میرے غائبانہ دوست ہیں' میں نے ان کی کتاب ''انشائی تنقید'' ۲۰۰۹ء میں شائع کی تھی لیکن اس وقت تک ان سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ کہ جمیل آذر نے اپنا ادب کدہ راولپنڈی میں بنا رکھا تھا جہاں وہ اپنی تنہائی میں بیٹھ کر تخلیقی کام کرتے تھے اور میرا مستقل قیام لاہور میں تھا جہاں میں اچھے اچھے مصنفین کی تلاش میں رہتا تھا اور ان کی کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کرتا تھا' میں نے ۲۰۰۹ء میں اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' شائع کی تو دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ یہ ملک کے ان ادیبوں تک پہنچ جائے جنہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ مقبول اکیڈمی کے مصنفین کے نام اور پتے تو میرے دل پر لکھے ہوئے تھے۔ کچھ نئے نام اور پتے میں نے محترم ڈاکٹر انور سدید' ڈاکٹر طارق عزیز اور جناب اظہر جاوید ایڈیٹر ''تخلیق'' سے حاصل کئے۔ ان میں جمیل آذر صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ میں نے انہیں اپنی کتاب ڈاک کے ذریعے بھیجی تو چند روز کے بعد ان کا خط آ گیا لیکن یہ محض رسمی خط نہیں تھا بلکہ اس کتاب کے مطالعے کا جوہر تھا جو انہوں نے تبصرے کی صورت میں لکھ دیا تھا۔ میں اس بات پر فخر کا اظہار کر سکتا ہوں کہ ''سفر جاری ہے'' کو پاک و ہند میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور جس کسی کو یہ کتاب ملی

Marfat.com

اس نے اس پر اظہار خیال ضرور کیا۔ لیکن جمیل آذر صاحب کے تبصرے میں بڑی اپنائیت تھی، میں نے فون پر شکریہ ادا کیا تو دوسری طرف سے یہ شیریں آواز آ رہی تھی۔

"ملک صاحب! مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ میں اپنا زندگی نامہ پڑھ رہا ہوں"۔

ان کی یہ بات بھی میرے دل کو لگی۔ میں نے جواب میں صرف یہ کہا:

"سب دیہاتیوں کی زندگی ایک جیسی ہوتی ہے' اور انہیں یکساں قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟"

پروفیسر جمیل آذر کا تبصرہ میرے دوست انور سدید نے پڑھا تو انہوں نے آذر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھیں جو ایک طرف "سفر جاری ہے" پر تبصرے کی حیثیت رکھے تو دوسری طرف خود ان کی زندگی کے ایسے واقعات پر مشتمل ہو جو "سفر جاری ہے" کے واقعات سے مماثلت رکھتے ہیں۔ جمیل آذر صاحب کو یہ تجویز پسند آئی' اور پھر انہوں نے تین چار ماہ میں یہ کتاب لکھ ڈالی جو "راہ نورد شوق" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس تمام عرصے میں جمیل آذر صاحب سے میری ٹیلی فون ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ راولپنڈی' اسلام آباد کے جن دوستوں سے ان کا ذکر ہوتا وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے۔ ان کی طبعی شرافت اور ادب میں ان کی گہری دلچسپی کی داد دیتے بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جمیل آذر ولی اللہ ہو گئے ہیں اور ان کو ملنا ثواب ہے' ان کو دیکھنا کسی ہمدمِ دیرینہ کو دیکھنا ہے جس کی ملاقات مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر ہوتی ہے' اور پھر وہ لمحہ آ گیا جب میں ترکی کے سفر پر اپنے بچوں کے ساتھ جا رہا تھا اور مجھے استنبول کی فلائٹ راولپنڈی سے لینا تھی۔ جس کے انتظار میں چار پانچ گھنٹے چک لالہ ایئرپورٹ پر انتظار کرنا تھا جو اب بے نظیر بھٹو شہید ایئرپورٹ کے نام سے موسوم ہے، میں نے ارادہ کر لیا کہ راولپنڈی میں جمیل آذر صاحب کو سلام کر کے آگے جاؤں گا۔ اب اتفاق دیکھئے کہ لاہور اسلام آباد فلائٹ لیٹ ہو گئی۔ اسلام آباد پہنچتے پہنچتے رات کے نو بج گئے۔ لیکن میں نے بھی مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ جمیل آذر سے ملے بغیر استنبول نہیں جاؤں گا۔ اپنے بیٹے ڈاکٹر ارشد کے ہمراہ

Marfat.com

ٹیکسی لے کر بھاگم بھاگ ان کے دولت کدے پر پہنچا تو دیکھا جمیل آذر میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہم جنم جنم کے واقف ہیں۔ان کی جو تصویر ان کی کتاب ''انشائی تنقید'' کی پشت پر چھپی تھی۔اس میں تقدس نمایاں ہے۔اب جو ملے اور باتیں کرنے لگے تو محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے انسان ہیں جو بازار سے گزر رہے ہیں لیکن دنیا کے خریدار نہیں۔مکالمہ ان کی زندگی کو کشادہ کرتا ہے اور مصنفین عالم سے ملاقات ان کے خیالات کو وسعت دیتی ہے۔ان کا انشائیہ ایسے ہی تصورات اور خیالات کا آئینہ ہے جس کے مضامین ان پر غیب سے اترتے ہیں اور زمینی انسانوں کے راہنما بن جاتے ہیں۔اس ملاقات کا نشہ اب تک طاری ہے بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ترکی کے سفر میں جمیل آذر میرے ساتھ ساتھ رہے کیونکہ میں اس ملاقات کو ہمہ وقت یاد کرتا رہا تھا۔

پروفیسر جمیل آذر انگریزی ادب کے استاد ہیں۔ان کا ادبی سفر مزاح نگاری سے شروع ہوا تھا۔انہوں نے مزاحیہ مضامین لکھنے کا آغاز رسالہ ''لیل ونہار'' سے کیا تھا' جہاں ایڈیٹر سبط حسن ان کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔پھر ان کی ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا سے ہوگئی جو ان دنوں ''اوراق'' کی ادارت کر رہے تھے۔انہوں نے ہی جمیل آذر کو انشائیہ لکھنے پر آمادہ کیا۔اب ان کا نام اردو انشائیہ کے تعارف نگاروں میں ہوتا ہے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد اردو انشائیہ میں ان کے نام اور کام کو سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔

جمیل آذر ۳۰ جون ۱۹۳۰ء کو متحدہ پنجاب کے مشہور شہر انبالہ میں پیدا ہوئے تھے۔چھٹی جماعت تک تعلیم لاہور کے سکولوں میں حاصل کی لیکن ساتویں سے نویں تک اپنے آبائی شہر انبالہ سے امتحانات پاس کئے۔اس دوران پاکستان بن گیا اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ لاہور آ گئے اور مسلم ماڈل ہائی سکول اردو بازار لاہور میں داخل ہو گئے۔وہ اس واقعے کو تاریخی قرار دیتے ہیں کہ پاکستان میں میٹرک کا جو پہلا امتحان منعقد ہوا وہ اس میں شامل ہوئے تھے۔انہوں نے ایم اے انگریزی اور اردو کا امتحان گارڈن کالج راولپنڈی سے طالب علم کی حیثیت سے کیا جو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے وابستہ تھا۔اور شعبۂ روزگار کے طور پر محکمہ تعلیم کو منتخب کیا اور گورنمنٹ کالج اصغر مال

Marfat.com

راولپنڈی میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ جمیل آذر ۱۹۹۰ء میں اپنی سروس کی میعاد پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے تو ان کی زندگی میں انقلاب آ چکا تھا۔ ان کی طبیعت دین کی طرف تو پہلے ہی راغب تھی اور اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے لیکن اب انہوں نے پوری توجہ ''قال اللہ'' ''قال الرسولؐ'' کی طرف مبذول کر لی اور اپنی ظاہری صورت میں بھی تبدیل کر لی۔ پہلے ان کے چہرے پر علم و ادب کی معصومیت جھلکتی تھی۔ اب دین اسلام کا تقدس نمایاں نظر آنے لگا۔ ان سے ملاقات ہوئی تو وہ اس اعزاز پر فخر کرتے تھے کہ انہیں اللہ نے پانچ مرتبہ مکہ معظمہ آنے کا بلاوا بھیجا اور انہیں پانچ مرتبہ مسجد نبویؐ میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

جمیل آذر اردو انشائیے کا ایک بڑا نام ہے۔ ان کے انشائیوں کے تین مجموعے ''شاخ زیتون''..... ''رت کے مہمان'' اور ''وقت اے وقت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے ایک کتاب ''اردو کے بہترین انشائیے'' کے نام سے بھی مرتب کی تھی۔ ان کی ادبی شخصیت کا زاویہ ''تنقید'' میں بھی ظاہر ہوا ہے اور انہوں نے مختلف موضوعات پر بڑے خیال افروز مضامین لکھے ہیں۔ اس دوران ہی انہوں نے ایک نیا نظریۂ تنقید پیش کیا جو ''انشائی تنقید'' کے نام سے معروف ہوا۔ ان کے تنقیدی مضامین کی کتاب بھی ''انشائی تنقید'' سے موسوم ہے جسے چھاپنے کا اعزاز مقبول اکیڈمی کو حاصل ہو چکا ہے۔

جمیل آذر کے اس نظریئے کو ڈاکٹر وزیر آغا، محمد کاظم، اظہر جاوید، صائمہ نورین بخاری، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، انجم نیازی، پروفیسر پروین طارق اور ڈاکٹر انور سدید نے بھی بہت سراہا ہے اور اب یہ جمیل آذر کی پہچان میں بھی شامل ہو گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اتنی حوصلہ افزائی ملنے پر جمیل آذر پھولے نہیں سماتے ہوں گے لیکن ان سے ملاقات ہوئی اور میں نے سخن شناسوں کی اس تحسین کا ذکر کیا تو جمیل آذر صاحب ہمہ تن انکسار بن گئے۔ انہوں نے اسے اپنا کارنامہ قرار نہیں دیا بلکہ بڑے فخر سے کہا ''میں جب لکھتا ہوں تو دنیا سے کٹ جاتا ہوں۔ مجھ سے کوئی ماورائی طاقت لکھواتی ہے۔ یہ نظریہ عوام کی بھلائی اور ادب کی بہتر تفہیم کا نظریہ ہے لیکن یہ بھی اسی تخلیق کار

Marfat.com

کی عطا ہے جس نے یہ کائنات بنائی ہے۔الحمد اللہ الحمد اللہ.....ایسے ادیب اب کہاں نظر آتے ہیں جو زندگی کی اتنی منزلیں طے کرنے اور کئی کتابیں لکھنے کے بعد بھی اپنی انا کا پرچم بلند نہ کریں اور اپنی تخلیق کو ایسے لمحے کا حاصل قرار دیں جو ان پر ''بے خودی'' طاری کر دیتی ہے؟.....پروفیسر جمیل آذر کا ظاہر باطن ایک ہے اور وہ ایک نیک دل اور سادہ انسان ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے اور دین و دُنیا میں انہیں کامیابیاں اور کامرانیاں عطا فرمائے۔(آمین)

Marfat.com

جمیل اطہر قاضی

جمیل اطہر قاضی ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے عملی زندگی کے آغاز سے پہلے صحافت کے خارزار میں قدم رکھ دیا تھا۔ انہوں نے اس خارزار میں آبلہ پائی کو اپنی زندگی کا مشن بنایا تو قلم کو تلوار بنا کر اُنگلیاں فگار کرلیں، لیکن اپنا خامہ خونچکاں ہی رکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے صحافت کی پہلی سیڑھی پر اپنی طالب علمی کے ابتدائی دور میں ہی قدم رکھ دیا تھا۔ اخبار ''غریب'' لائل پور (فیصل آباد) روزنامہ ''زمیندار'' لاہور، روزنامہ ''آفاق'' لائل پور، روزنامہ ''امروز'' لاہور اور انگریزی اخبار ''دی سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور کی نامہ نگاری سے آغاز کیا۔ پھر ''آفاق'' لائل پور کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے اور لائل پور میں روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' اور روزنامہ ''امروز'' کی نمائندگی کے علاوہ روزنامہ ''نوائے وقت'' کے سٹاف رپورٹر مقرر کیے گئے۔

انہوں نے ''پاک نیوز سروس'' قائم کی۔ ایک ایڈورٹائزنگ فرم کا سنگِ بنیاد رکھا اور پھر اخبار ''وفاق'' کے ایڈیٹر بن گئے جو انہوں نے مصطفیٰ صادق صاحب کے تعاون سے ۱۹۵۹ء میں پہلے ہفت روزہ کے طور پر جاری کیا اور پھر ۱۹۶۲ء میں روزنامہ بنا دیا۔ یہاں جمیل اطہر صاحب نے

Marfat.com

ایک اخبار کو مختلف شہروں سے شائع کرنے کا تجربہ کیا جس کی تقلید ملک کے نامور اخبارات نے بھی کی۔ ۱۹۷۴ء میں روزنامہ ''تجارت'' اور ۱۹۸۲ء میں اخبار ''جرأت'' جاری کیا جو اب لاہور کے علاوہ راولپنڈی، مظفر آباد، میر پور (آزاد کشمیر)، کوئٹہ اور پشاور سے بیک وقت شائع ہوتا ہے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ جمیل اطہر قاضی نے صحافت کی گھٹی کو ایک ''بتِ کافر'' کی طرح قبول کیا جو عمر بھر چھٹتی نہیں ہے۔

جمیل اطہر قاضی مشرقی پنجاب میں ۱۱ مئی ۱۹۴۱ء کو سرہند شریف کے قاضی سراج الدین سرہندی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن کے ابتدائی سال تحریکِ پاکستان کے سرگرم دور میں گزرے اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تو قاضی صاحب کا خاندان ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں آباد ہو گیا۔ میٹرک تک تعلیم اس دُور افتادہ شہر میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) کا رُخ کیا۔ جمیل اطہر کے باطن میں ادب کا شوق سرہند شریف کے قیام کے ابتدائی زمانے میں ہی پیدا ہو گیا تھا، لیکن انہوں نے انسانی مسائل میں زیادہ دلچسپی لی اور قلمی اظہار کے لئے صحافت کو وسیلہ بنایا۔ یہ ایسا شعبہ ہے جس میں ''خبر'' کا افسانہ نہیں بنایا جاتا، بلکہ واقعہ سے ''خبریت'' اخذ کی جاتی ہے تو صداقت اور حقیقت کو فوقیت دی جاتی ہے۔ جمیل اطہر نے بائی سکول کی طالب علمی کے زمانے میں لائل پور (فیصل آباد) کے اخبارات کی نمائندگی اختیار کی تو اظہار کا اپنا قرینہ خود پیدا کیا۔ خبر کو ادب کے انداز میں پیش کیا۔ تبصرے میں حالات کے عوامی رُخ کو پیش کیا اور اپنے علاقے کے غریبوں کی نمائندگی کی تو ان کی آواز لاہور کے حکومتی ایوانوں میں بھی سنی گئی اور اہلِ صحافت نے ان کے سر پر تاج زرنگار رکھا تو اخبارات کے ایڈیٹروں کی ملک گیر تنظیم سی، پی، این، ای (کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز) کے پانچ دفعہ نائب صدر منتخب کئے گئے اور پھر بلا مقابلہ صدر منتخب ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ اخبارات کے مالکان کی تنظیم اے، پی، این، ایس کے سینئر وائس پریذیڈنٹ بھی چنے گئے۔ گویا ٹوبہ ٹیک سنگھ کے دُور افتادہ مقام سے اُبھرنے والے اس صحافی کو دو ملک گیر تنظیموں میں قیادت کا فریضہ سونپا گیا اور

Marfat.com

انہوں نے کراچی، لاہور، اسلام آباد، پشاور اور دیگر بڑے شہروں کے اخبارات کے مالکان اور مدیران کے حقوق کی نگہبانی کی اور ان کی قیادت کا فریضہ انجام دیا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

جمیل اطہر قاضی نے پاکستان کی اُردو صحافت کو جمال بھی عطا کیا اور اسے جلال آشنا بھی کیا ہے، لیکن ان کے باطن میں ایک وضعدار اور طرحدار ادیب بھی موجود تھا، وہ سرہند شریف سے رخصت ہو کر پاکستان میں آباد ہونے کے لئے ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچے تو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات کو اپنی روح میں اُتار چکے تھے۔ ان کی تعلیمات کا ایک زاویہ عجز و انکسار اور فروتنی کا تھا تو دوسرا زاویہ دُنیا کے جھوٹے خداؤں کے سامنے کلاہ کج رکھنے اور حکمت الٰہیہ پر عمل کرنے کا تھا۔ یہ دونوں زاویئے جمیل اطہر نے اپنی زندگی میں قبول کئے اور ہمیشہ ان پر عمل کیا اور پھر ''شیخ سرہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے آفاق گیر شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے شیخ سرہند کے پیغام ربانی کے فروغ و تبلیغ کے لئے ''حضرت مجدد الف ثانی سوسائٹی'' قائم کر رکھی ہے جس کے وہ صدر ہیں۔

جمیل اطہر قاضی میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں، مقبول اکیڈمی کی نئی کتاب چھپتی ہے تو خرید کر پڑھتے ہیں اور جب کبھی ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں تو ہمارے گھر کو اس خوشبو سے معطر کر دیتے ہیں، جو ان کے بدن میں ''شیخ سرہند'' نے سرایت کر دی تھی۔ مجھے ان کی کتاب ''شیخ سرہند'' نے بھی بہت متاثر کیا ہے۔ یہ کتاب روحانی فیض کا سرچشمہ ہے۔ اس کا مطالعہ روح کے بند دروازوں کو کھول دیتا ہے اور انسان پر فیوض ربانی نازل ہونے لگتے ہیں۔ دل کا آئینہ صاف ہو جاتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ جمیل اطہر قاضی مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔ میرے ادارے کی کامیابی میں ان کی دُعائیں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت مند عمر دراز کرے۔ (آمین)

Marfat.com

مولانا حامد علی خان

مولانا حامد علی خان اس انگریز دشمن خاندان کے فرد تھے جس کے بعض افراد نے سیاست اور صحافت کے وسیلے سے وطن عزیز کو برطانوی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی صرف کر دی تھی۔ قوم کے یہ فردِ جلیل ظفر علی خان تھے جنہوں نے اپنے اخبار ''زمیندار'' کے ذریعے انگریزی حکومت اور آل انڈیا کانگرس کا ناطقہ بند کئے رکھا۔

حامد علی خان، ظفر علی خان کے بھائی تھے۔ ان کی جدامجد مولوی سراج الدین نے وزیر آباد کے قریب اپنا گاؤں کرم آباد کے نام سے قائم کیا تھا اور اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور ادب کے فنی رموز سکھائے۔ چنانچہ اس خاندان کے بیشتر بچے بڑے ہو کر اردو کے نامور ادیب بنے۔ ان میں ظفر علی خان، حامد علی خان، حمید احمد خان، راجہ مہدی علی خان، فاروق علی خان اور خواتین میں سے حمیدہ بیگم (ح، ب صاحبہ) اور زہرہ بیگم (ز، ب صاحبہ) بہت مشہور ہیں۔

حامد علی خان شاعر تھے، ادیب تھے، دانشور تھے، عملی طور پر سیاست دان نہیں تھے لیکن سیاست کے رموز جانتے تھے۔ ادبی رسالہ ''ہمایوں'' کے مدیر تھے اور اس رسالے کی وساطت سے انہوں نے نئے لکھنے والوں کی ذہنی، ادبی اور تحریری راہنمائی کی اور پرانے لکھنے والوں کو اپنے علم و فضل

Marfat.com

سے استفادہ کا موقعہ دیا اوران کی تخلیقات پر مفید مشورے دیئے۔ پڑھنے والوں کو حیرت ہوگی کہ جوش ملیح آبادی' اثر صہبائی' سعادت حسن منٹو' اسد ملتانی اور احمد ندیم قاسمی جو آج اردو ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں' ان کے فنی مشوروں کی قدر کرتے تھے۔ اور ''ہمایوں'' میں چھپنا ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ہمایوں کے ناشر اور مدیر میاں بشیر احمد تھے جو قائداعظم کے ایما پر بعد میں سیاست میں آ گئے۔

مولانا حامد علی خان ۱۰ جنوری ۱۹۰۱ء کو وزیر آباد کے قریب موضع کرم آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں ہی پائی جہاں ایک انگریز استاد انہیں ابتدائی درجوں میں اردو پڑھاتے تھے۔ کالج میں تعلیم اسلامیہ کالج لاہور اور علی گڑھ میں حاصل کی۔

لیکن اس دوران میں ان کی انگریز دشمنی پروان چڑھ چکی تھی اور انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ڈگری لینے کی بجائے بی اے کی ڈگری پنجاب نیشنل کالج سے حاصل کی جو لالہ لجپت رائے نے قائم کیا تھا اور جس کے پرنسپل چھبیل داس تھے۔ ایم اے عربی میں بھی زیرِ تعلیم رہے لیکن نصاب کی تکمیل سے قبل ہی ممتاز ادبی رسالہ ''ہمایوں'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ ان کا اُردو زبان و ادب کا مطالعہ اتنا وسیع اور تلفظ اتنا صحیح تھا کہ انہیں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ادبی مشیر کے طور پر مقرر کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں پطرس بخاری ریڈیو دہلی پر کھینچ لے گئے تھے۔ اس وقت لاہور کے متعدد نوجوان ادیب مثلاً سعادت حسن منٹو' راجہ مہدی علی خان' ن' م' راشد' کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک ان کے معاصرین میں شامل تھے اور دہلی ریڈیو ادب کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا حامد علی خان واپس لاہور آ گئے اور جدید ترین اخبار ''امروز'' کے ساتھ وابستہ ہو گئے جو بائیں بازو کا اخبار تھا لیکن انہیں اس کی پالیسی اور روس دوستی پسند نہ آئی اور مستعفی ہو گئے۔ اخبار ''نوائے وقت'' کے مدیر حمید نظامی نے اپنے ادارے سے ادبی رسالہ ''مخزن'' جاری کیا تو انہوں نے اس کی ادارت حامد علی خان کے سپرد کر دی۔ پس منظر حقیقت یہ بھی ہے کہ حمید نظامی کے مضامین کی نوک پلک مولانا سنوارتے تھے اور یہ ''ہمایوں'' میں چھپتے تھے

Marfat.com

جس کے مدیر مولانا حامد علی خان تھے۔ جب ادارہ ''نوائے وقت''، ''مخزن'' کے طباعتی اخراجات کا بوجھ نہ سنبھال سکا تو بند کر دیا گیا۔ لیکن اب مولانا نے اپنا ذاتی رسالہ ''الحمراء'' نکال لیا۔ ۱۹۵۴ء میں امریکی حکومت نے لاہور میں مکتبۂ فرینکلن قائم کیا تو اس کی نگرانی پر مولانا حامد علی خان کو مامور کیا۔ ان کو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور ترجمہ روانی سے کرتے تھے۔ مولانا حامد علی خان نے امریکی ادب کی بہت سی مشہور کتابوں کے ترجمے لاہور کے بڑے بڑے ادیبوں سے کرائے اور ان کی اشاعت کے لئے مقامی ناشرین کی خدمات حاصل کیں۔ پاکستان کی ابتدائی زندگی میں مکتبۂ فرینکلن کے ان تراجم کو بہت اہمیت ملی تھی۔ مولانا کی خوبی یہ تھی کہ وہ ترجمے کے معیار پر نظر رکھتے اور اچھے ترجمے کا خطیر معاوضہ دیتے۔ دوسری طرف اشاعت و طباعت کے لئے بھی پوری چھان بین کرتے تھے اور ناشر کی دیانتداری اور کاروباری ساکھ کو فوقیت دیتے تھے۔

مولانا حامد علی خان کے ساتھ میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب مقبول اکیڈمی لاہور میں اپنا مقام بنا چکی تھی اور اس کی چھپی ہوئی کتابوں پر ملک کے طول و عرض کے ادبی رسائل میں شاندار تبصرے چھپ رہے تھے۔ مولانا حامد علی خان سادہ طبع انسان اور ہمدرد خلائق شخصیت تھے۔ مقبول اکیڈمی کی چھپی ہوئی کتابوں کی انہوں نے ہمیشہ قدر افزائی کی اور کتاب چھپ کر آتی تو اس کی تحسین خط لکھ کر کرتے۔ میں کبھی دفتر میں حاضر ہوتا تو اٹھ کر ملتے اور جتنی دیر وہاں بیٹھتا صرف کاروباری باتیں ہی کرتے۔ دفتر کے اوقات میں گپ شپ لگانا ان کے لئے کفر تھا۔ تاہم وہ تنگ مزاج یا تنگ نظر نہیں تھے۔ مسکراتے تو سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو ان کی خوشی کا احساس ہو جاتا۔ میں نے ان کو قہقہہ مارتے کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی دوستی ''ادبی'' دنیا کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر سے تھی۔ کبھی کبھی یہ دوست مل کر مقبرہ جہانگیر پر چلے جاتے اور دن بھر پکنک مناتے۔ ان میں سے ہر ادیب کا مزاج مختلف تھا لیکن سب کی دوستی پکی تھی اور ایک دوسرے کی عزت دل و جان سے کرتے تھے۔ مکتبۂ فرینکلن بند ہو

Marfat.com

گیا تو مولانا حامد علی خان نے آزاد زندگی کو ترجیح دی۔ انہوں نے اپنا مکان ماڈل ٹاؤن میں بنالیا اور وہیں بچوں کے ساتھ مقیم ہو گئے۔ انہیں خوشی تھی کہ انہوں نے مکتبۂ فرینکلن میں نادر و نایاب کتابیں چھاپی تھیں۔ ان کا اہم ترین کام ''اردو کا جامع انسائیکلو پیڈیا'' ہے۔ غالب کی صد سالہ یادگار منائی گئی تو دیوانِ غالب کے متن کی صحت مولانا حامد علی خان نے کی اور اب یہ دیوان ہی مستند سمجھا جاتا ہے۔

مولانا نے ادب کی سب اصناف کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا۔ ''حامد کے سو شعر'' کے نام سے ایک کتابچہ ان کی زندگی میں شائع ہوا۔ وفات کے بعد ان کے کلام کا مجموعہ ''نوا ہائے راز'' کے نام سے ان کے صاحبزادوں نے شائع کیا۔ مولانا نے ''ہمایوں'' کی ادارت کے زمانے میں افسانوں کے جو تراجم کئے تھے ان کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔ بطور مدیر ان کے نام لکھنے والوں کے سینکڑوں خطوط آتے تھے۔ مولانا نے یہ سب خطوط الگ الگ فائلوں میں محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط کا مجموعہ بھی ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اور اب حوالے کی ایک اہم کتاب شمار ہوتی ہے۔

مولانا زیادہ لمبی بات نہیں کرتے تھے لیکن ان کا مختصر جملہ بھی دوسرے ادیبوں کی لمبی گفتگو پر حاوی ہوتا تھا۔ نئے لکھنے والوں کو بڑی محبت سے ملتے اور ان کے سوالات کے جوابات پوری تفصیل سے دیتے تھے۔ وہ اعلیٰ روایات کا احترام کرتے تھے اور اسلامی قدروں کے پاسبان تھے۔ جعفر بلوچ نے ان کا سب کلام جمع کر لیا تھا لیکن خود جعفر بلوچ ہی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ مولانا میری عزت افزائی میں کوئی کسر نہ رکھتے اور میرے ادارے کو ہمیشہ اچھی کتابیں چھاپنے کو دیتے۔ مولانا ۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو تھوڑا سا عرصہ علیل رہنے کے بعد وفات پا گئے۔ ان کے صاحبزادے شاہد علی خان نے ان کی یاد میں رسالہ ''الحمراء'' جاری کر رکھا ہے جو اس وقت اردو کا ایک شاندار ادبی جریدہ ہے۔

Marfat.com

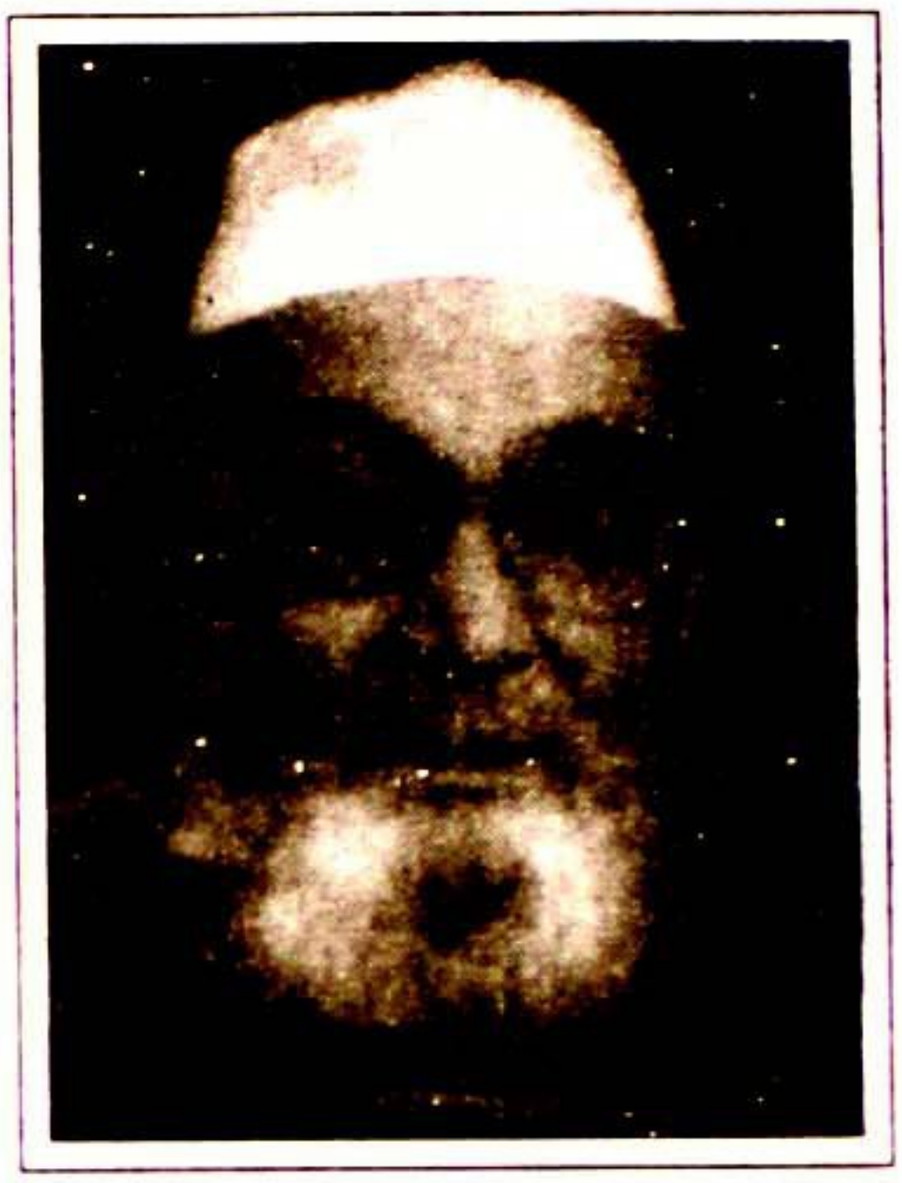

حفیظ تائب

حفیظ تائب کا نام زبان پر آئے تو ایک معصوم و مقدس چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی اور چہرے پر سفید ڈاڑھی، آنکھوں میں حیا جس کا جلوہ عینک سے چھن کر باہر آتا تھا۔ بات کرتے تو ایک ایک لفظ سے انکسار جھلکتا، میں انہیں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ غزل کہتے تھے اور مشاعرے پڑھتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے قلبِ حزیں کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت سے سرفراز فرمایا اور وہ نعت کہنے لگے۔ نعت نگاری کے دوران حفیظ تائب نے کچھ ایسے سرمدی نغمے رُوح کی گہرائیوں سے اُبھرتے ہوئے سنے کہ دُنیاداری سے رُخ موڑ لیا اور سالکِ راہِ حق ہو گئے۔ غزل نگاری ترک کر دی اور اپنی زندگی نعت نگاری کے لئے وقف کر دی۔ وہ صوفی منش انسان تھے، مزاج درویشانہ رکھتے تھے، جب کبھی اپنے بھائی عبدالمجید منہاس صاحب کے ہاں جاتے تو وہ ان کی پذیرائی اس عقیدت سے کرتے جیسے کوئی ولی اللہ ان کے گھر آ گیا ہو۔ ان سے فرمائش کر کے نعت سنتے اور کبھی کبھی دوستوں کو جمع کر کے ''محفلِ نعت'' بھی سجاتے۔ اس محفلِ مقدس میں حفیظ تائب نعت پڑھتے تو یوں محسوس ہوتا کہ روضۂ اقدس کے سامنے کھڑے ہیں۔ سبز گنبد کے مکین کے سامنے اپنے ایمان کی تازگی کے

Marfat.com

لئے سیرتِ نبویؐ بیان کررہے ہیں۔

اے سرورِ دیں نور ہے یکسر تیری سیرت　　اقدار کو کرتی ہے منوّر تیری سیرت
یاخیر کا معمورۂ پُرنور و معنبر　　یاحسن کا موّاج سمندر تری سیرت

اوراس کے ساتھ ہی اپنی کیفیت بھی حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کردیتے۔

ہر رہ پہ میرا ہاتھ لئے ہاتھ میں اپنے　　چلتی ہے مرے ساتھ برابر تری سیرت

حفیظ تائب ۱۴ فروری ۱۹۳۱ء کو احمد نگر ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ایف اے کا امتحان زمیندارہ کالج گجرات سے پاس کیا اور پھر اپنی زندگی آپ بنانے کے لئے محکمہ بجلی میں ملازمت اختیار کرلی، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ملازمت کے دوران ہی پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے پنجابی کی ڈگری لی۔ محکمہ بجلی کی تیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۷۹ء میں ریٹائرمنٹ لے کر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں لیکچرار مقرر ہوگئے اور چند برسوں کے بعد ''یوسف زلیخا کے قصے'' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا، لیکن اپنی طبیعت کے فطری انکسار کی وجہ سے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ کبھی ''ڈاکٹر'' نہیں لکھا، کہتے تھے کہ اس سے نخوت کی بو آتی ہے، لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ وہ دونوں جہانوں کی عظمتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں دیکھتے تھے اور انسان کو کسی درجے میں بھی مقام امتیاز دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ ایک دفعہ مقبول اکیڈمی میں تشریف لائے تو کہنے لگے کہ نعت نگار کو ہمیشہ سر نیچے کرکے چلنا چاہئے اور وہ یوں محسوس کرے کہ وہ مدینے کی گلیوں میں چل رہا ہے اور سامنے گنبدِ خضرا ہے۔ ان کی اپنی نعت کی کتاب ''صلو علیہ وآلہ'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ ملا تو کہنے لگے اس کتاب کے سامنے یہ ایوارڈ ہیچ ہے۔ یہ انعام دُنیاداروں کو نصیب ہو، مجھے جو طمانیت نعت لکھ کر محسوس ہوتی ہے، ''اس سے بڑا کوئی انعام نہیں''۔ حفیظ تائب نے ''اُردو کے نعت گو'' شعراء کا ایک تذکرہ لکھنے کے علاوہ ایک کتاب میں ''پنجابی نعت'' کا انتخاب بھی شائع کیا تھا۔ مقبول اکیڈمی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ حفیظ تائب کی نعتوں کا ایک مجموعہ ''وسلّموتسلیما'' کے عنوان سے شائع کیا، جس کی پذیرائی ہندو پاک میں وسیع

Marfat.com

پیمانے پر ہوئی۔اس مجموعے کی متعدد نعتیں انہوں نے نعت کے مشاعروں میں پڑھیں اور اب ان کی وفات کے بعد ٹیلی ویژن پر پیش کی جاتی ہیں۔

روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ادبی صفحے کے انچارج عمران نقوی نے حفیظ تائب کا انٹرویو کیا تو انہوں نے کہا:

''میں گیارہ بارہ سال کی عمر میں نعت خوانی کرنے لگا تھا۔ میٹرک میں سکول کی لائبریری میں سے میں ظفر علی خان کی کتابیں جاری کروا کر لاتا اور ان کا نعتیہ کلام اپنی کاپی پر لکھنا شروع کر دیتا۔ ادھر بشیر منذر جیسا ساتھی اور مولانا بشیر احمد صمصام جیسے استاد میسر آ گئے تو میرا ادبی ذوق نکھرنے لگا۔ قاری احمد حسن کے لحن داؤدی میں مولانا حضرت احمد رضا بریلوی کا نعتیہ کلام سننے، پڑھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ محمد یوسف چشتی نعت خوان کی دوستی بھی بہت کام آئی۔ محمد اعظم چشتی کی نعت خوانی نے مہمیز کا کام کیا، چنانچہ میں خود بھی نعتیں لکھنے لگا..... کالج میں اور کچھ عرصہ بعد تک نعت کے ساتھ نظم اور غزل بھی لکھتا رہا، لیکن انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں نے اپنے لئے نعت مبارک منتخب کر لی۔ پھر رفتہ رفتہ طبیعت نعت میں ڈوبتی چلی گئی۔ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں تھا۔

''حفیظ تائب کو نعت میں عالمی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ عشقِ نبویؐ میں ڈوب کر اور حضوری کی کیفیت کو دل پر وارد کر کے نعت کہتے تھے۔ امریکہ کے دورے پر گئے تو کئی محفلوں میں صرف حفیظ تائب سے نعتیں سنی گئیں اور یہ نعت تو ہر جگہ فرمائش کر کے سنی جاتی تھی۔

دے تبسم کی خیرات ماحول کو، ہم کو درکار ہے روشنی یا نبیؐ
ایک شیریں جھلک، ایک نوریں دمک، تلخ و تاریک ہے زندگی یا نبیؐ

خود انہیں اپنی زندگی میں ہی یہ احساس ہو گیا تھا اور وہ اس پر نازاں بھی تھے کہ:

Marfat.com

نعتِ حضرت میری پہچان ہے سبحان اللہ　　یہی دُنیا، یہی ایمان ہے، سبحان اللہ
جس سے پہلے کسی تخلیق کا عنوان نہ تھا　　وہ مرے شعر کا عنوان ہے، سبحان اللہ

کراچی کے رسالہ ''نعت رنگ'' میں حفیظ تائب کی نعت گوئی کا تذکرہ ان الفاظ میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب نے کیا ہے:

''حفیظ تائب صاحب نے نعت شروع کی۔ لہجہ محبت اور ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور نگاہیں یوں جھکی ہوئی جیسے مواجہ شریف میں کھڑے ہوں۔ پورا وجود دست بستہ..... آواز نرم..... مؤدب اور نبی کریمؐ کے احساس سے پست..... ''اے اہل ایمان اپنی آوازوں کو نبی اکرمؐ کی آواز سے بلند نہ کرو.....'' ہزاروں میل کے فاصلے پر حضورؐ کا یہ احساس اور یہ شرف اللہ اکبر!''۔

انور سدید نے اپنے ایک مضمون میں، جس کا عنوان ہے۔ ''طیورِ قدسی کا ہم زبان..... حفیظ تائب'' انہوں نے اپنا تاثر یوں پیش کیا:

''وہ نعت پڑھ رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ ان کا وجود محفل سے عنقا ہوگیا ہے۔ صرف ان کے ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے، محسوس ہوتا کہ وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر کلام منظوم پیش کرنے کی بجائے روضۂ اقدس کی جالیوں کو چوم رہے ہیں اور ہدیۂ نعت حضوری کی کیفیت میں پیش کر رہے ہیں''۔

حفیظ تائب نے اپنی ایک نظم میں نعت گوئی کے آداب بھی درج کئے ہیں۔

نعت گوئی کے لئے حسنِ ارادت شرط ہے
ساتھ کچھ فہم کتاب و علم سیرت شرط ہے
اس میں لازم ہے جمالِ فن بھی اوج فکر بھی

Marfat.com

جتنی ممکن ہو خیالوں کی شہادت شرط ہے
گر ادب پہلا قرینہ ہے ثنا کے شہر میں
ہر قدم اس راہ میں عجزِ طبیعت شرط ہے

حفیظ تائب کو عمر کے آخری حصے میں سرطان کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ تکلیف جب بڑھ جاتی تو اسے کمال حوصلے سے برداشت کرتے اور قصیدہ بردہ کا ورد کرنے لگتے۔ اس سے درد کی شدت کم ہو جاتی۔ حفیظ تائب نے اس موذی مرض کے ساتھ چھ سات سال گزارے۔ جب ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے دیا تو ان کے بھائی عبدالمجید منہاس انہیں اپنے گھر پر لے آئے اور ان کی تیمارداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تو ان کے پلنگ پر بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دباتا۔ حفیظ تائب سمٹتے جاتے اور مجھے ٹانگیں دبانے کی اجازت نہ دیتے۔ اس وقت مجھے تو دلی سرور حاصل ہو رہا ہوتا تھا، لیکن وہ خود اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکتے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ آخری دنوں میں نبی اکرمؐ کا نام سن کر ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی، اچانک ایک دن زیرلب درود پڑھتے ہوئے ان کی روح پرواز کر گئی۔ ان کا جنازہ عبدالمجید منہاس کے گھر سے اُٹھا، ان کی وفات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی تھی، ان کے جنازے میں لاہور کے بہت سے ادیب شامل تھے، سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

جناب عبدالمجید منہاس نے ان کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ''حفیظ تائب فاؤنڈیشن'' اور ''نعت فورم'' قائم کر رکھا ہے۔ ایک کتابی سلسلہ ''مدحت'' کے نام سے جاری کیا ہے، جس کے روحانی سرپرست حضرت حفیظ تائب ہیں۔ ان کے یوم وفات پر ایک شاندار تقریب منعقد کی جاتی ہے جس میں حفیظ تائب کی نعت نگاری کا تذکرہ افراط سے ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے ایک مخلص دوست سے محروم ہو گیا ہوں، جس کے تمام انداز کریمانہ تھے اور جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا مدح خواں اور نعت نگار تھا۔ حق تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

Marfat.com

حمید اختر

حمید اختر کو میں ترقی پسند تحریک کے مخلص ترین رکن کی حیثیت میں پہچانتا ہوں اور ان کی بے پناہ عزت کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنی زندگی کو مالی اثاثوں سے بوجھل کرنے کی بجائے اپنی نظریاتی وابستگی کو برقرار رکھ کر اپنی روح کو سرشار کیا۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ جب سجاد ظہیر کو کمیونسٹ پارٹی نے آزادی کے بعد پاکستان میں خدمات انجام دینے کے لئے بھیجا اور انہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لئے زیرزمین رہنا ضروری ہو گیا تو اس وقت انہوں نے حمید اختر پر اعتماد کیا اور ان سے اپنے پیغام بردار کا کام لیا۔ پنجاب کے کسی اور ترقی پسند ادیب، حتیٰ کہ اس پارٹی کے سیاسی کارکنوں کو بھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور حمید اختر اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ حمید اختر ایک لمبے عرصے سے ایک موذی جسمانی مرض میں گرفتار ہیں، وہ اس کا مقابلہ پوری ہمت سے کر رہے ہیں روزانہ صحافت کی مشقت کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ روز نیا کنواں کھودتے ہیں، روز نیا پانی برآمد کرتے ہیں۔ دوست ان کی دوستی پر ناز کرتے ہیں اور دشمن انہوں نے کسی کو بنایا ہی نہیں۔ اکیسویں صدی میں جب وطن عزیز میں ہر طرف خودغرضی، اور منافقت کا دور دورہ ہے یہ انفرادیت صرف حمید اختر کو حاصل ہے۔

Marfat.com

حمید اختر متحدہ پنجاب کے مشہور شہر لدھیانہ میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم اس شہر میں ہی حاصل کی جو ساحر لدھیانوی اور م۔حسن لطیفی کے بعد اب ڈاکٹر کیول دھیر کی وجہ سے ادبی دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ابن انشاء جوان دنوں شیر محمد قیصر کے نام سے مشہور تھے ان کے ہم جماعت تھے سکول کے زمانے سے ہی انہیں ادب پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ساحر لدھیانوی کی دوستی نے اس شوق کو پروان چڑھانے میں مدد کی اور جب روزگار کی تلاش میں بمبئی گئے تو ساحر لدھیانوی نے ہی انہیں فلمی دنیا میں نہ صرف متعارف کرایا بلکہ انہوں نے دو فلمیں پروڈیوس بھی کیں، محترم اظہر جاوید نے مجھے بتایا کہ حمید اختر جب پاکستان آئے تو انہوں نے ایک فلم میں اداکاری بھی کی تھی لیکن ادب کا رجحان انہیں اس مصنوعی دنیا سے نکال کر لے گیا اور وہ صحافت کی طرف راغب ہو گئے۔اظہر جاوید نے ہی بیان کیا کہ حمید اختر نے صحافت کی تربیت بمبئی میں حاصل کر لی تھی۔وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار ادبی جلسوں کی روداد ''رسالہ ''نظام''، بمبئی میں لکھا کرتے تھے جو اب کتاب کی صورت میں ''رودادِ انجمن'' کے نام سے چھپ چکی ہے اور یہی ان کی صحافت کا آغاز تھا۔

حمید اختر پاکستان آئے تو انہوں نے اپنا رزق حاصل کرنے کیلئے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔انہی دنوں میاں افتخار الدین نے لاہور سے ایک جدید اخبار خوبصورت گیٹ اپ میں ''امروز'' کے نام سے جاری کیا تھا۔حمید اختر نے بھی اس اخبار میں ملازمت اختیار کی اور سچ یہ ہے کہ اپنے قلم کو خوب رواں رکھا۔وہ آمریت کے دشمن تھے۔انسان کی آزادی کے لئے جدوجہد کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔پاکستان کے دگرگوں حالات پر لکھنے پر آتے تو صرف عوام کے حقوق کی پاسبانی کرتے۔

آمر حکمران کو ان کی یہ دوستی پسند نہ آئی اور ترقی پسند تحریک پر پابندی عائد کی تو حمید اختر کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔اس دور کی یادگار کتاب ''کال کوٹھڑی'' ہے جو حبسیاتی ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔اخبار ''امروز'' پر آمر ایوب خان نے

Marfat.com

شب خون مارا تو حمید اختر کو بھی جبراً ملازمت سے فارغ کر دیا گیا لیکن ان کے صحافت کے جنون نے ان کو فارغ نہ بیٹھنے دیا اور اخبار ''آزاد'' جاری کیا جس میں عبداللہ ملک ان کے معاون تھے۔اس اخبار نے بھی عوام کی حمایت اور آمریت کی مخالفت کا سلسلہ جاری رکھا۔لیکن بقول اظہر جاوید.....
حمید اختر نے ''آزاد'' اخبار کو صحیح معنوں میں آزادی اظہار کا نمائندہ بنا دیا اور صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا۔لیکن ان کا یہ تجربہ کاروباری لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور اخبار بند کر دیا گیا۔

اپنی بیکاری کا یہ دور حمید اختر نے بڑی جرأت مندی سے گزارا۔مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے یا ان سے دفتر ''تخلیق'' میں ملاقات ہوتی تو ہمیشہ خندۂ پیشانی سے ملتے اور اپنی اقتصادی پریشانیوں کا کبھی ذکر تک نہ کرتے۔صرف یہ پوچھتے کہ میرے ادارے سے کون کون سی نئی کتابیں چھپی ہیں اور پھر نئے نئے موضوعات بتاتے کہ ان پر کتابیں لکھوائی جانی چاہئیں۔اچھے مشورے دینے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

حمید اختر کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔تھوڑے سے عرصے کے لئے فلم سے وابستہ ہوئے اور پھر صحافت کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔''امروز'' اور ''آزاد'' کے دور کو ان کی صحافت کا زریں دور قرار دینا چاہئے۔تاہم جب لاہور سے ایک نیا اخبار ''دن'' جاری ہوا تو وہ ''کالم نگاری'' کی طرف آ گئے۔روزنامہ ''ایکسپریس'' میں بھی انہوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔
حمید اختر نے ان دو اخبارات میں اداریہ نگاری کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔قومی اور بین الاقوامی مسائل پر ان کے دوررس تجزیوں کو صحافتی اور ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے ادارتی مشوروں کی صدائے بازگشت حکومت کے ایوانوں میں بھی سنی جاتی ہے۔ان کے کالموں کے مجموعے ''احوال واقعی'' اور ''پرسش احوال'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔حال ہی میں ان کی سوانح عمری جناب احمد سلیم نے تالیف کی ہے۔یہ کتاب حمید اختر کے حالات حیات پر مبنی ہے لیکن یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ زمانے کو اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔مشکلات اور صعوبتیں ان کا راستہ روکتی ہیں لیکن وہ اپنی ہمت مردانہ سے جاں ہار مصیبتوں کو بھی عبور کر جاتے

Marfat.com

ہیں اور ۸۶ء ویں سالگرہ منا لینے کے بعد بھی مستعد اور فعال ہیں۔

حمید اختر کو خود نمائی سے شدید نفرت ہے۔ وہ قریبی دوستوں کی محفل میں بھی اپنے کام کی خود تعریف نہیں کرتے اور ملال کا اظہار کرتے ہیں کہ روزی روٹی کی مصروفیت نے انہیں ادب کا فریضہ پوری طرح انجام دینے کی فرصت نہیں دی۔ تاہم ان کے افسانوں کو ادبی حلقوں میں ہمیشہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ ''آشنائیاں کیا کیا'' ان کے ایسے خاکوں کا مجموعہ ہے، جس میں ان کے نامور دوست مثلاً فقیر احمد فقیر'' ساحر لدھیانوی' سید سجاد ظہیر' سبط حسن وغیرہ سب زندہ نظر آتے ہیں۔ گزشتہ برس حکومت پاکستان نے انہیں ''تمغۂ حسن کارکردگی'' دیا تو میں نے انہیں مبارکباد پیش کی۔ حمید اختر نے میری مبارکباد خندۂ پیشانی سے قبول کی' انہوں نے اخبار ''ایکسپریس'' میں اس ''کم عمری'' میں ایوارڈ دینے پر حکومت کا شکریہ ادا کیا اور یہ بھی لکھا کہ ''چلو پچاس برس'' کی عمر تک قلم گھسانے کے بعد حکمرانوں اور سرکاری ادبی ادارے کو میری صلاحیتوں کا علم تو ہوا، میرے لئے یہی کافی ہے''..... میں سمجھتا ہوں کہ حکومت اور سرکاری ادبی ادارے نے حمید اختر کو تو جواب اپنی زندگی کا ۸۶ واں سال گزار رہے ہیں' تمغۂ حسن کارکردگی دے کر دراصل اس ایوارڈ کا کھویا ہوا اعتماد بحال کیا ہے۔ اور غنیمت ہے کہ انہیں یہ ایوارڈ ان کی زندگی میں مل گیا جبکہ اردو کے ممتاز مزاح نگار' ادیب اور دانشور پطرس بخاری کو یہ ایوارڈ ان کی وفات سے پون صدی بعد دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے اور طویل زندگی دے۔ (آمین)

Marfat.com

حمید کاشمیری

حمید کاشمیری جن کا پیدائشی خاندانی نام عبدالحمید تھا' ۱۹۲۹ء میں بانسرہ گلی (مری) میں پیدا ہوئے۔ان کا آبائی وطن سری نگر کشمیر تھا۔لیکن والد غلام نبی تلاش روزگار میں نکلے تو بانسرہ گلی میں آ کر آباد ہو گئے۔حمید کاشمیری کی پرورش مری کی خوشگوار وادیوں میں ہوئی لیکن شومئے قسمت سے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے لیکن فطرت نے انہیں حالات کا مطالعہ غور سے کرنے اور واقعات کا تجزیہ کرنے کی عمدہ صلاحیت عطا کی تھی۔ماں کی گود ہی ان کا گہوارہ بن گئی اور ان سے کہانیاں سنتے سنتے وہ کتابوں کی طرف راغب ہو گئے۔پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی منتقل ہو گئے تھے اور خود بھی کہانیاں لکھنے لگے تھے جو ملک کے ادبی حلقوں میں پسند کی جانے لگیں تو عبدالحمید کے اندر سے افسانہ نگار حمید کاشمیری بیدار ہو گیا۔جس نے کراچی کی گلیوں میں زندگی کو قریب سے دیکھا اور گلی کے ہر موڑ پر ایک زندہ کہانی کو چلتے پھرتے دیکھا تو اس کا نقش کاغذ پر اتار دیا۔

تعلیم کی کمی کو پورا کرنے کیلئے انہوں نے کراچی کی مشہور گزرگاہ انفنسٹن سٹریٹ میں ایک بک سٹال قائم کیا جہاں عورتوں اور مردوں کا تانتا لگا رہتا۔شام کو شہر کے نامور ادیب جمع ہو جاتے۔معاشی لحاظ سے حمید کاشمیری نے خوشحال زندگی نہیں گزاری لیکن وہ متوسط طبقے کے محنت

Marfat.com

کش انسان تھے۔روکھی سوکھی کھا کر بھی خدا کا شکر ادا کر کے خوش ہوتے کہ ان کی دکان پر غلام عباس' سید انور' ابراہیم جلیس' ابن انشاء، مشفق خواجہ اور فرمان فتح پوری جیسے ادیب آتے تھے اور ان کی کہانی چھپتی تو اس پر بحث کرتے اور حمید کاشمیری کی تحسین بھی کرتے تھے۔

آزادی کے بعد کراچی علم وادب کا بڑا مرکز بن گیا تھا۔نئے اخبارات اور رسائل جاری ہو گئے تھے۔پہلے ریڈیو قائم ہوا۔پھر ٹیلی ویژن آ گیا۔حمید کاشمیری کا نام اخبارات اور رسائل سے نکل کر ریڈیو اور ٹی وی پر پہنچا تو ان کی خوشحالی کا دور شروع ہو گیا۔ان کے افسانوں نے ڈراموں کا روپ اختیار کرنا شروع کر دیا اور حمید کاشمیری ٹی وی کے مقبول ڈرامہ نگار بن گئے جو زندگی کا حقیقی ترجمان تھے۔ان کے افسانوں کے بارے میں ممتاز نقاد فرمان فتح پوری نے لکھا۔

''حمید کاشمیری کے افسانے موضوعات کے لحاظ سے رنگا رنگ ہیں اور صاف پتہ دیتے ہیں کہ افسانہ نگار نے ان کے بارے میں بار بار سوچا ہے' اور سوچ کو احساس اور جذبے میں ڈھالنے کے بعد قلم اٹھایا ہے''۔

مشفق خواجہ نے ان کے فن کے بارے میں رائے دی۔

''حمید کاشمیری عام افسانہ نگاروں کی طرح افسانہ نگاری نہیں کرتا بلکہ کرداروں کی چند خصوصیات کو اسی طرح نمایاں کر دیتا ہے کہ ان کی پوری شخصیت سامنے آ جاتی ہے''۔

ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دیواریں'' ۱۹ افسانوں پر مشتمل ہے اور انہوں نے ہر افسانہ کراچی کی عام انسانی زندگی پر لکھا ہے۔ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے ڈرامے ''کافی ہاؤس'' کے نام سے چھپے۔انہوں نے سعادت حسن منٹو کو ادبی عدالت میں پیش کر کے ایک زبردست ڈرامہ لکھا تھا جو ٹیلی ویژن پر بہت مقبول ہوا۔

حمید کاشمیری سے میرا غائبانہ تعارف میرزا ادیب نے کرایا تھا۔انہوں نے ہی مجھے کراچی جا کر حمید کاشمیری سے ملاقات کرنے اور ان سے افسانوں کا ایک مجموعہ اشاعت کے لئے حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔میں کراچی گیا تو ان کے بک سٹال پر حاضر ہوا۔انہوں نے نہ صرف

Marfat.com

مجھے ''دیواریں'' کے حقوق اشاعت دے دیئے بلکہ وعدہ کیا کہ آئندہ بھی ان کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے ہی شائع ہوں گی۔ میں نے ان کی جو کتابیں شائع کیں ان میں ''دیواریں'' کے علاوہ ''سرحدیں''.....''ادھورے خواب''.....''کافی ہاؤس'' اور ''منٹو ادبی عدالت میں'' شامل ہیں۔ اس دوران حمید کاشمیری سے میرے تعلقات اتنے گہری اور مستحکم ہو گئے کہ میں کراچی جاتا تو وہ میرے میزبان بن جاتے۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ کراچی میں انہوں نے میرا تعارف محترمہ حسینہ معین اور ہاجرہ مسرور سے کرایا اور مقبول اکیڈمی کو ان کی کتابیں شائع کرنے کا افتخار حاصل ہوا۔

حمید کاشمیری نے ابتدائی زندگی عسرت میں گزاری تھی لیکن وہ مضبوط اخلاقیات کے پرخلوص مشرقی انسان تھے۔ ان کی کتابوں کی دکان پر لڑکیاں اعتماد سے آتیں اور کتابیں خرید کر لے جاتیں۔ ان کے دوست عبدالقیوم ان کی زندگی کی کہانی جان کاشمیری کے رسالہ ''قرطاس'' میں لکھ رہے ہیں۔ انفنسٹن سٹریٹ میں چھوکرے لڑکیوں کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ اس قسم کے واقعات میں حمید کاشمیری لڑکیوں کو پناہ دیتے اور غنڈوں کو پولیس کے حوالے کر دیتے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے کو ''جوڈو کراٹے'' کا شوق پیدا ہو گیا تو گردن کے منکے میں کڑی چوٹ لگی۔ علاج کے لئے لندن جانا پڑا۔ خدا کا شکر کیا کہ بچے کی جان بچ گئی لیکن واپس آئے تو خود زیادہ دن نہ جئے۔ اردو افسانے کی بساط سے ایک نامور شخصیت اور مقبول اکیڈمی کا ایک محسن رخصت ہو گیا۔ اس مخلص انسان کو میں ہمیشہ یاد کرتا رہتا ہوں۔

اللہ کریم انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

Marfat.com

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اورینٹیل کالج لاہور سے ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن اس کالج سے انہیں اتنی محبت ہے کہ روزانہ اس کالج کا ایک چکر ضرور لگا لیتے ہیں اور طلبا و طالبات کو ان کی تعلیمی، علمی اور ادبی مشکلات کا حل بتانے اور ان کی رہنمائی کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ ایم اے اردو کرنے کے لئے لاہور آئے اور اس کالج میں داخل ہوئے تو اورینٹیل کالج نے انہیں اپنی محبت میں جکڑ لیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انہیں اس کالج سے عشق ہو گیا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اپنی نسبتیں مضبوطی سے قائم رکھنے والے ادیب ہیں۔ مثلاً ان کی ایک محبت مجید امجد سے بھی ہے جس کے ساتھ ان کا رابطہ جھنگ میں قائم ہوا اور اب ان کی وفات کے بعد زیادہ مضبوط ہو گیا۔

خواجہ محمد زکریا ۱۹۳۳ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ پاکستان معرض وجود میں آیا تو ان کا خاندان پاکستان ہجرت کر آیا اور جھنگ میں آباد ہو گیا، گویا خواجہ محمد زکریا کی تربیت جھنگ جیسے دور افتادہ مقام پر ہوئی۔

Marfat.com

اس شہر کا اپنا ایک مزاج ہے جسے خواجہ زکریا نے بھی دل و جان سے قبول کیا۔ وہ لاہور تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے اور پھر یہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ انہوں نے اپنا مسکن اورینٹیل کالج کو بنایا۔ درمیان کے کچھ وقفوں کے لئے وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی گئے۔ چند سال چین اور جاپان میں بھی گزارے لیکن زندگی کا بیشتر حصہ اورینٹیل کالج میں ہی اردو کے طلبا کی خدمت کے لئے وقف کیا اور اب وہ لاہور کے مستقل باسی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے جھنگوی مزاج کو جس میں جمالیات کا زاویہ اور محبت کا عنصر نمایاں ہے قائم رکھا ہے۔ اور وہ اورینٹیل کالج کے تمام اساتذہ سے مختلف نظر آتے ہیں تو اس میں جٹی ہیر کے دیس کے اثرات موجود ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا بالعموم اس مشکل کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں جسے بالعموم دوسرے اساتذہ بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال اکبر الہ آبادی پر ان کا پی ایچ ڈی کا کام ہے۔ ان سے قبل یہ موضوع اورینٹیل کالج کے دو تین اساتذہ نے منظور کرایا تھا لیکن وہ اس اہم کام کی مناسبت سے تحقیق کی محنت نہ کر سکے اور کام چھوڑ گئے۔ خواجہ صاحب نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور پھر اکبر الہ آبادی کے متعلق بہت سی نئی چیزیں سامنے لے آئے۔ انہوں نے اپنے مقالے کو حرف آخر قرار نہیں دیا بلکہ اکبر الہ آبادی پر نئی معلومات کی تلاش میں اب بھی سرگرداں رہتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے مجید امجد کی کلیات کی ترتیب و تدوین میں محنت اور جان کاوی کا ثبوت دیا۔ مجید امجد کی وفات کے بعد متعدد لوگوں نے مجید امجد پر کام کر کے اپنی شہرت کی دکان چمکائی لیکن خواجہ صاحب نے صبر و تحمل سے کام لیا اور آہستہ آہستہ مجید امجد کی نظموں اور غزلوں کی تلاش میں مصروف رہے۔ اب ان کی مرتبہ کلیات مجید امجد کو ہی بنیادی مستند حوالہ سمجھا جاتا ہے۔ حفیظ جالندھری اور عبدالحمید عدم کی کلیات کی ترتیب و تدوین ان کا قابل قدر علمی کارنامہ

Marfat.com

ہے۔اردو نظم اور اردو غزل کا انتخاب ان کے ذوق نظر کا آئینہ دار اور ان موضوعات پر کام کرنے والوں کے لئے بنیادی کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا نے ہمیشہ اصولوں کی پاسداری کی ہے۔مثال کے طور پر وہ زندہ ادیبوں پر تحقیق کرانے کے حق میں نہیں تھے۔چنانچہ جب وہ شعبۂ اردو کے صدر اور اورینٹیل کالج کے پرنسپل بنے تو انہوں نے زندہ ادیبوں پر پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دی۔حالاں کہ پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں زندہ ادیبوں پر افراط سے کام ہو رہا ہے اور اس بات کا چرچا بھی عام ہے کہ جس ادیب پر تحقیقی کام کیا جا رہا ہو وہ خود پی ایچ ڈی سکالر کا معاون بن جاتا ہے۔وہ ادیب ہی انہیں بہت کچھ لکھ کر دے دیتا ہے۔بہت سا جھوٹ کام کرنے والے کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔تحقیق صداقت سے بعید ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب ان دنوں ''تاریخ ادبیات اردو مسلمانان پاک و ہند'' کی صحت کاری میں مصروف ہیں۔یہ منصوبہ پروفیسر حمید احمد خان کے دور میں بنا تھا اور اس کے ابواب متعدد نقادوں نے لکھے تھے۔مجموعی نگرانی سید فیاض محمود نے انجام دی تھی۔لیکن اس میں بہت سی اغلاط راہ پا گئی تھیں۔خواجہ زکریا صاحب کی نظر ثانی سے اب اس کتاب کی تین جلدیں شائع ہو گئی ہیں۔

خواجہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے معاصر نقادوں اور ادیبوں کے کام کی تحسین کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔مثلاً تحقیقی کام میں انہوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر رشید حسن خان، مختار الدین احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کی ہمیشہ تعریف کی ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ تخلیق کار کے مقابلے میں تنقید نگار کو کم تر درجے کا ادبی کام کرنے والا شخص شمار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا کی تصنیفات اور تالیفات میں ''اردو میں قطعہ نگاری'' نئے پرانے

Marfat.com

خیالات، تفہیم بال جبریل''چند اہم جدید شاعر''.....اقبالیات چند نئی جہات'انتخاب مجید امجد، اکبرالہ آبادی'تحقیق وتنقیدی مطالعہ وغیرہ شامل ہیں۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں ان کی خدمت میں جب کبھی حاضر ہوا انہوں نے میرے اشاعتی امور اور انتخاب کتب میں ہمیشہ مفید مشورے دیئے۔

انہوں نے ایک خط میں میری خودنوشت ''سفر جاری ہے'' کی تعریف کی اور اسے ایک رہنما کتاب قرار دیا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

Marfat.com

قاضی ذوالفقار احمد

پہلے تو میرا خیال یہ تھا کہ قاضی ذوالفقار احمد پڑھتے بھی زیادہ تھے اور لکھتے بھی زیادہ تھے اور میں نے انہیں کثیر المطالعہ اور کثیر التحریر مصنفین میں شمار کیا لیکن پروفیسر تنویر حسین نے جواب ڈاکٹر تنویر حسین بننے والے ہیں، میری تصحیح کرنے کا سوچا تو اپنا قولِ فیصل یہ دیا ہے کہ قاضی ذوالفقار احمد ایک زود نویس ادیب تھے لیکن جتنا وہ پڑھتے تھے، اگر اتنا ہی لکھتے تو ملک میں کاغذ کا کال پڑ جاتا۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ قاضی صاحب پڑھتے زیادہ تھے، لکھتے کم تھے لیکن میرا ان سے اختلاف یہ ہے کہ انہوں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اسے اگر کم لکھنا کہا جائے تو زیادہ لکھنا کسے کہیں گے؟ میں نے یہ سوال پروفیسر تنویر حسین سے اس وقت کیا تھا جب وہ اِسلامیہ کالج لاہور کے آسمان سے گر کر شیخوپورہ کے ایک کالج کی کھجور میں جا اٹکے تھے اور ان کے پاس میرے اعتراض کا جواب دینے کے لئے کافی وقت تھا۔ اب وہ لاہور واپس آ گئے ہیں اور اس سوال سے کنی کترا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کے پاس جواب نہیں ہے، لیکن میں اپنے بیان پر قائم ہوں کہ:

''قاضی ذوالفقار احمد کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو پڑھتے بھی زیادہ تھے اور لکھتے بھی زیادہ تھے۔ ان کی آنکھ مطالعے میں رہتی تھی، ذہن نتائج اخذ کرنے میں اور ہاتھ لکھنے میں

Marfat.com

مصروف رہتے تھے، اس سب کا ثمر ان کی تصنیفات اور تراجم ہیں، جن کی تعداد مجھے معلوم نہیں اور نہ معلوم ہو سکتی ہے"۔

قاضی ذوالفقار احمد کو ادب اپنے والد غلام احمد عاکف صاحب سے ورثے میں ملا تھا۔ عاکف صاحب روزنامہ "انقلاب" کے ہیڈ کاتب تھے۔ وہ "انقلاب" کے پہلے صفحے کی سرخی لکھتے تو مولانا عبدالمجید سالک انہیں اپنی کرسی سے اُٹھ کر داد دیتے تھے۔ وہ پنجابی شاعر بھی تھے۔ قاضی صاحب کو ان کا یہ شعر اب بھی یاد تھا اور جب عاکف صاحب کا ذکر آئے تو مجھے بھی سنایا کرتے تھے۔

لہندے پاسے مسجد ساڈی، نلکا نالے جاری
برنا وچ عظیم سوہایا، کرم کیتا رب باری

اس شعر میں جس مسجد کا ذکر ہے اس میں قاضی صاحب کے بزرگان نے خطابت اور امامت کے فرائض ادا کئے تھے اور بچے بالے سب اسے "ساڈی مسجد" ہی کہتے تھے۔ فیض عام کا یہ سلسلہ ان کی خاندان کی وراثت تھی، لیکن انگریزی حکومت کے دور میں جب حالات نے پلٹا کھایا تو قاضی ذوالفقار احمد کے والد نے انہیں دیوبند میں تعلیم کے لئے بھیجنے کی بجائے مقامی مدرسوں میں تعلیم دلائی۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء ہے۔ انہوں نے بی اے اِسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ پھر ایم اے کے ساتھ ایم ایڈ میں بھی کامیابی حاصل کی۔ بیگووالا ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہونے والا یہ مصنف ۱۹۵۷ء میں مستقل طور پر لاہور میں آباد ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں جناب حنیف رامے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے تو انہوں نے اقبال ٹاؤن میں ادیبوں کو بھی پلاٹ دیئے۔ قاضی صاحب کو یہ پلاٹ مروجہ قیمت پر جہاں زیب بلاک میں ملا، جہاں انہوں نے ۱۹۸۱ء میں اپنا مکان تعمیر کر لیا اور اسے اپنا "خلوت کدہ" قرار دیا جہاں وہ مطالعہ کرتے اور غیب سے مضامین اترتے تو صریرِ خامہ نوائے سروش بن جاتا۔ واضح رہے کہ قاضی صاحب کل وقتی ادیب نہیں تھے۔ وہ محکمہ تعلیم میں ملازم تھے۔ نوکری کی ابتداء ساڑھے بائیس روپے ماہانہ سے کی،

Marfat.com

لیکن ترقی کے دروازے ان کی محنت نے کھولے اور ۱۹۸۹ء میں ریٹائر ہوئے تو وہ انیسویں گریڈ تک پہنچ چکے تھے اور ان کی تنخواہ ہزاروں میں تھی، اب پنشن بھی ہزاروں میں ہے۔

قاضی ذوالفقار احمد کو ابتداء میں کہانیاں لکھنے کا شوق تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''تلاش'' کے نام سے شائع ہوا۔ اب یہ نایاب ہو چکا ہے اور قاضی صاحب کے پاس بھی اس کی کوئی کاپی موجود نہیں۔ ان کے مطالعے نے ان کی توجہ ناول نگاری کی طرف دلائی تو انہوں نے دو تاریخی ناول لکھے۔ ایک کا نام ''قدم قدم پاکستان'' اور دوسرے کا ''مستان خان'' ہے..... ان ناولوں میں پاکستان کی تشکیل کے حالات درج ہیں تو انہوں نے بعض زندہ رہنے والے کرداروں کا تعارف بھی بڑی خوبصورتی سے کر دیا ہے جو بدی کے اندر سے خیر کو اُجاگر کرتے اور معاشرے کی تعمیر میں صحت مند انداز میں شرکت کرتے ہیں۔ اُردو کے ایک نامور نقاد نے قاضی ذوالفقار احمد کو نسیم حجازی کے اسلوب کا ناول نگار قرار دیا ہے۔ ان کا ناول ''سینڈرا''، ہپی تحریک کا بیانیہ ہے جس میں حقیقت پسندانہ انداز غالب ہے اور ناول کو معلومات کا خزینہ بنا دیا گیا ہے۔

قاضی ذوالفقار احمد نے اپنی زندگی خود بنائی، انہیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان میں قدریں ٹوٹنی شروع ہو گئیں اور تعلیم کا محکمہ بھی اپنا اعلیٰ اخلاقی معیار قائم نہ رکھ سکا تو قاضی ذوالفقار احمد غم زدہ ہو گئے۔ انہیں فخر تھا کہ وہ قوم کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دے رہے ہیں، ان کی شخصیت سازی کر رہے ہیں، لیکن منفی قوتیں زیادہ زور آور تھیں اور پاکستان کی زرخیز زمین کے نوخیز پودوں پر زہر کا چھڑکاؤ کر رہی تھیں۔ ملال کی اسی حالت میں انہوں نے قوم کو آئینہ دکھانے کے لئے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''منکہ ایک مدرس'' لکھی، جو تعلیم کے پس منظر میں ایک ناول بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی لحاظ سے وہ ممتاز مفتی اور احمد بشیر کے ساتھ کھڑے ہیں، جن کی آپ بیتیاں ناول کی ہیئت میں سامنے آئی ہیں۔ مقبول اکیڈمی سے ان کے دو معرکہ آرا ناول ''دیوی دیوتا'' اور ''دیوداسیاں'' شائع ہو رہے ہیں۔ علمی اور ادبی زاویے سے انہوں نے شرح نویسی کو خصوصی اہمیت دی اور دیوانِ غالب، بانگ درا اور بالِ جبریل کی شرح لکھی جو مقبول اکیڈمی نے

Marfat.com

شائع کیں۔ان کی ایک کتاب ''معرکہ ستمبر ۱۹۶۵ء'' بھی ادبی دُنیا میں بے حد مقبول ہوئی۔

قاضی ذوالفقار احمد مقبول اکیڈمی میں اکثر تشریف لاتے تھے، سادہ وضع کے اس ادیب کی باتیں سنتے تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ اکیسویں صدی میں اٹھارویں صدی کے انسان ہیں، جو اخلاقیات کا اعلیٰ معیار قائم رکھتے ہیں اور معاشرے کی بے راہروی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ مقبول اکیڈمی کے علاوہ مکتبۂ عالیہ، ابلاغ پبلشرز، سنگِ میل اور ٹیکنیکل پبلشرز نے بھی ان کی کتابیں شائع کی ہیں۔ان کی درسی کتب کو مجید بک ڈپو سے اشاعت حاصل ہوئی۔ تراجم کی کتابیں ادارہ تخلیقات سے سامنے آئیں۔ یہ سب کتابیں تعداد کے اعتبار سے ایک سو سے تجاوز کر چکی ہیں۔انہوں نے الطاف حسن قریشی کو تحسین کی کہ انہوں نے قاضی صاحب کے کام کو ''اُردو ڈائجسٹ'' میں نمایاں جگہ دی اور انہیں لکھنے کے لئے بچوں کی زبان استعمال کرنے کا انداز الطاف حسین قریشی نے سکھایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے، ''میری آج کی شہرت اور میرے کام کی قدر و قیمت ''اُردو ڈائجسٹ'' کی بدولت ہے''۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہوگی، لیکن میں اپنے اس اعزاز کا ذکر ضرور کروں گا کہ قاضی ذوالفقار احمد مقبول اکیڈمی کے مصنفین کے قافلے میں شامل تھے اور میرے دوست تھے۔

Marfat.com

رحمان مذنب

رحمان مذنب کا نام میں نے پہلی دفعہ سنا تو سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کیسا شخص ہے کہ ایک طرف اس کا نام ''رحمان'' سے شروع ہوتا ہے دوسری طرف وہ خود اپنے ''مذنب'' ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ان سے ملاقات ہوئی تو ان سے یہ سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی لیکن ان کی باتوں سے جو انکسار جھلکتا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ از سر تا پا مسکین طبع انسان ہیں۔اللہ کی ایک صفت عالیہ ان کی شخصیت کا حصہ ہے' لیکن دوسری طرف بندہ ہونے کے ناطے اپنے گناہگار ہونے کا اعتراف بھی کرتے ہیں۔ان کے بارے میں دوسری بات بھی حیرت انگیز تھی کہ لاہور کے مفتی خاندان کے فرد ہیں۔ان کے والد مفتی عبدالستار شاہی مسجد لاہور کے دارالفتاویٰ کے رکن تھے لیکن رحمان مذنب افسانہ نگار بن گئے اور اس بازار کی عورتوں کے افسانے لکھنے لگے جو عالمگیری مسجد کے ساتھ واقع ہے۔

ان سے تعلقات بڑھے اور میں نے ان سے ایک کتاب طباعت و اشاعت کے لئے مانگی تو انہوں نے بڑی سادگی سے کہا ''میں تو کئی مہینوں سے انتظار کر رہا تھا کہ آپ مجھ سے کتاب کی فرمائش کب کریں گے اور میں نے آپ کے ادارے کے لئے ایک کتاب آپ کے مزاج کے

Marfat.com

مطابق تیار کر رکھی ہے" اب میں نے سوال کیا کہ "میرا مزاج کیا ہے"؟ رحمان مذنب صاحب نے کہا آپ کے دل میں اسلام کی گہری محبت موجود ہے۔ میں نے آپ کا مزاج آپ کی باتوں سے اور لوگوں کے ساتھ آپ کے حسن سلوک سے اخذ کیا ہے۔ آپ کی تربیت آپ کی نیک ماں نے کی ہے" میں سن کر پہلے تو حیران ہوا کہ رحمان مذنب صاحب کا مشاہدہ عام لوگوں سے کتنا مختلف تھا لیکن پھر جب انہوں نے اپنی نئی کتاب "تہذیب و تمدن اور اسلام" طباعت کے لئے مقبول اکیڈمی کو دی تو میری حیرت رفع ہوگئی۔ عصمت فروش عورتوں پر افسانے لکھنے والا رحمان مذنب بھی اسلام کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا اور دوسری تہذیبوں کے مطالعے میں انہوں نے اسلام کو فوقیت دی تھی۔ میں نے ان کی یہ کتاب بڑی محنت اور سلیقے سے شائع کی اور آپ کے سامنے اعتراف کرتا ہوں کہ بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ میں نے رحمان مذنب صاحب سے اسی موضوع کی ایک اور کتاب طلب کی تو فرمانے لگے "آپ کی فرمائش میں نے دل پر لکھ لی ہے لیکن تحقیقی کتاب لکھنے میں بڑا وقت لگتا ہے، میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں مکمل ہوگئی تو آپ کو ہی پیش کروں گا"۔ اس دوران انہوں نے اپنے معمول کے موضوعات پر لکھے ہوئے افسانوں کے دو مجموعے "بالا خانہ" اور "رام پیاری" مجھے اشاعت کے لئے دیئے۔ میرے لئے خوشی کا باعث یہ تھا کہ اردو کا ایک بڑا مصنف مقبول اکیڈمی سے وابستہ تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ "بالا خانہ" میں طوائفوں کے افسانے ہیں لیکن ان میں عریانی یا فحاشی نہیں ہے۔ رحمان مذنب نے جسم فروش عورتوں کا کرداری مطالعہ کیا ہے اور ان کی فطرت کو پیش کیا ہے جس میں پیشہ روٹی کمانے کا ذریعہ بن جاتا ہے لیکن کردار کے اندر روح کی پاکیزگی موجود رہتی ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ "رام پیاری" کا منظر نامہ کسبی عورتوں کے بارے مرتب ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ رحمان مذنب کا موضوع صرف طوائف نہیں تھی بلکہ وہ پوری زندگی کے افسانہ نگار تھے۔

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ رحمان مذنب کی طوائف نگاری کا موازنہ ڈاکٹر وزیر آغا نے سعادت حسن منٹو سے کیا تھا اور دونوں کے مشاہدے کے زاویئے مختلف قرار دیئے تھے لیکن یار لوگ

Marfat.com

یہ بات لے اڑے کہ وزیر آغا نے رحمان مذنب کو سعادت حسن منٹو سے بڑا افسانہ نگار قرار دیا تھا۔ مقبول اکیڈمی کے مرکزی دفتر میں ادبائے کرام آتے اور کتابوں کی الماریوں میں رحمان مذنب کی کتاب ''بالا خانہ'' دیکھتے تو یہ سوال بھی اٹھاتے لیکن میں یہ کہہ کر اپنی جان کی امان پا لیتا کہ دونوں افسانہ نگار اپنے اپنے فیلڈ میں منفرد ہیں۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ رحمان مذنب کی تربیت عالمگیری مسجد لاہور کے دارالفتاویٰ کے مہتمم مفتی عبدالستار کے دینی گھرانے میں ہوئی اور ان کے خاندان کے ایک بزرگ مفتی عبداللہ ٹونکی اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے استاد تھے۔ رحمان مذنب بچپن میں بڑے کھلنڈرے تھے، ایک دن خود ہی بتانے لگے کہ میں نے اپنے بچپن میں اپنی دلچسپیوں کے سب کھیل کھیلے ہیں، سکول سے واپس آ کر میں محلے میں نکل جاتا اور گرد و پیش کے سب مناظر غور سے دیکھتا۔ مجھے تھیٹر میں بھی دلچسپی تھی اور سینما کی خاموش فلمیں دیکھنے کا چسکا بھی تھا۔ چوباروں سے موسیقی کی آوازیں اٹھتیں اور گھنگھرو کھنکھتے تو میرے کان کھڑے ہو جاتے اور میں گلی میں رک کر گانا سننے لگتا۔ کبھی کبھی چوبارے پر بھی پہنچ جاتا۔ لیکن بچہ سمجھ کر کوئی اعتراض نہ کرتا اس طرح میرے اندر میرا ذوق پروان چڑھتا گیا،'' لیکن دوسری طرف رحمان مذنب گھر آتے تو بڑے مسکین بن جاتے۔ والد صاحب اپنے پاس بٹھا لیتے اور ان سے فتوے نقل کراتے۔ فتویٰ نگاری میں انہوں نے دسترس حاصل کر لی تھی اور کبھی کبھی خود بھی خط پڑھ کر سائل کا جواب لکھ دیتے تھے لیکن کہتے تھے کہ والد صاحب کو دکھائے بغیر میں نے اپنا لکھا ہوا فتویٰ کبھی کسی کو نہیں بھیجا۔

رحمان مذنب کی خوبی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں ہی کتابوں کو پڑھا اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا مطالعہ بھی کیا۔ ان دونوں میں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تو وہ افسانے لکھنے لگے اور اس کے ساتھ ہی شاعری بھی کرنے لگے، ان کا افسانہ چل گیا لیکن شاعری نہ چلی، میں نے وجہ پوچھی تو بولے'' شاعری پر میں نے پوری توجہ نہیں دی۔ دوسرے شاعری میں بات اشارے کنائے میں کی جاتی ہے لیکن افسانہ تو زندگی کے ہر زاویئے کی تشریح کرتا ہے اور ہمارے سامنے

Marfat.com

کہانی ہی نہیں جیتے جاگتے کردار بھی لے آتا ہے۔

شاعری میں کردار کے حقوق نکھارے نہیں جاسکتے۔دوسرے شاعری اندر کی بات کو پیش کرتی ہے' افسانے اور ناول میں پورے معاشرے کو بے نقاب کیا جاتا ہے' رحمان مذنب ان خوش قسمت افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کے فن کی تحسین ان کی زندگی میں مولانا صلاح الدین احمد مدیر ادبی دنیا' مولانا حامد علی خان مدیر ہمایوں' شاہد احمد دہلوی مدیر ساقی' وزیر آغا مدیر ''اوراق'' اور ڈاکٹر انور سدید مدیر ''اردو زبان'' نے کی۔آخری دو ادیبوں نے ''منٹو' مذنب تنازعہ'' میں ثالث کا کردار ادا کیا' لیکن کچھ لوگ اب بھی کہتے ہیں کہ یہ تنازعہ ''اوراق'' اور ''اردو زبان'' نے کھڑا کیا تھا۔ادبی رسائل کے مدیران کے علاوہ رحمان مذنب کے فن کی تحسین ممتاز مفتی' رام لعل' مرزا حامد بیگ' ریاض احمد' غلام الثقلین نقوی' صابر لودھی' احتشام حسین اور سید عابد علی عابد جیسے نامور نقادوں نے بھی کی ہے۔

رحمان مذنب نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۷ء میں کیا، ان کا آخری افسانہ رسالہ علامت میں ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔اس لحاظ سے ان کا تخلیقی سفر ساٹھ برس سے زیادہ عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر ۱۷ کتابیں لکھیں۔ان میں سے چند کتابوں پر انہیں ایوارڈ بھی دیئے گئے لیکن میرا ذاتی مشاہدہ یہ ہے کہ رحمان مذنب شہرت کے کبھی طلبگار نہیں ہوئے۔وہ حلقۂ ارباب ذوق کے مستقل رکن تھے اور بحث کا آغاز انہیں سے ہوتا تھا۔ان کے فن اور شخصیت پر ایک کتاب ڈاکٹر انور سدید نے ''تجھے ہم ولی سمجھتے'' کے نام سے لکھی تھی۔اس کے پروف ۱۶ فروری ۲۰۰۰ء کو پڑھ رہے تھے کہ حرکت قلب بند ہوگئی اور اس دنیا سے رحلت کر گئے ان کے صاحبزادے مفتی زریں بخت نے ان کے نام پر ایک فاؤنڈیشن قائم کی اور ان کی تمام کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر رشید امجد

اس دور میں رشید امجد مسلسل محنت کی زندہ مثال ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان اگر دیانتداری سے اپنا نصب العین حاصل کرنے کا ارادہ کر لے اور اس کے لئے کوششیں پیہم عمل میں لائے تو کامیابی اس کے قدم چوم لیتی ہے۔ رشید امجد نے بہت نچلے درجے سے عملی زندگی شروع کی اور اب علمی، ادبی اور تعلیمی دنیا میں بہت اونچے مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ یعنی اسلامی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر نشین ہیں۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے روایتی افسانے کی موضوعیت کو تبدیل کرنے میں ایک مجدد کا کردار ادا کیا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے اپنی زندگی خود بنائی، معاشرے میں بلند مقام حاصل کیا اور افسانوی ادب میں طرح نو کا باعث بن گئے۔ سچ ہے کہ اللہ جسے چاہے عزت دیتا ہے۔ اور رشید امجد اللہ کے مرغوب بندوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان کی خوبیوں کو دیکھ کر صدر پاکستان نے انہیں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' سے سرفراز کیا ہے۔

رشید امجد ۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو سری نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد غلام محمد مونس کشمیری قالینوں کے نقش ڈیزائن کرتے تھے۔ وہ کسی انگریز کی قالینوں کی فیکٹری میں ملازم تھے

Marfat.com

لیکن ایک چھوٹی سی فیکٹری اپنی بھی کھول رکھی تھی۔مونس ان کا تخلص تھا اور پنجابی اور کشمیری زبان میں شاعری بھی کرتے تھے۔فارسی پر عبور حاصل تھا۔طبیعت میں درویشی تھی۔امارت سے ہمیشہ نفرت کی اور فقیری میں شان پیدا کی۔یہ سب خوبیاں انہوں نے رشید امجد کے خون میں بھی منتقل کر دیں۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا تو یہ خاندان راولپنڈی میں آ گیا۔جہاں انہیں محلہ نانک پورہ میں ایک گوردوارے میں رہائش پذیر ہونے کے لئے جگہ مل گئی۔رشید امجد نے تعلیم کی منزلیں یہیں طے کیں۔لیکن یہ دور انہوں نے انتہائی غربت میں گزارا۔کئی مرتبہ اس اقتصادی بدحالی سے تنگ آ کر قسمت آزمائی کے لئے گھر سے نکل جاتے لیکن قسمت یاوری نہ کرتی۔میٹرک تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔کالج میں داخلہ تو مل گیا لیکن ان کا دل تعلیم میں نہ لگا، پھر خود کمائی کرنے کا خیال آ گیا اور پی ڈبلیو ڈی میں دیہاڑی پر کام کرنے لگے۔یہیں ان کی ملاقات اردو کے مشہور افسانہ نگار محمد منشا یاد سے ہوئی جو راولپنڈی میں ورکس انسپکٹر تھے۔منشا یاد نے انہیں کہانیاں پڑھنے کا شوق دیا۔قسمت نے مزید یاوری کی تو رشید امجد کو ملٹری کی ۵۰۱ سنٹرل ورکشاپ ایل ڈی سی میں نوکری دلا دی۔پھر چک لالہ میں ٹائم کیپر بن گئے۔یہاں ماجد الباقری اور اعجاز راہی سے دوستی ہوگئی۔اور ادب کی طرف ان کا قدم بڑھنے لگا۔شام کو کسی سستے چائے خانے میں بیٹھتے جہاں غلام رسول طارق استادی کا فرض ادا کرتے تھے۔انہوں نے رشید امجد کا افسانہ ''ادب لطیف'' چھپوایا۔ میرزا ادیب ایڈیٹر ادبِ لطیف نے اس افسانے کی بہت تعریف کی۔اب رشید امجد نے ٹائم کیپری چھوڑ دی اور ایک سکول میں اردو پڑھانے لگے۔دوسری طرف تعلیم سے اپنا ٹوٹا ہوا ناطہ پھر جوڑ لیا اور ایم اے تک پہنچ گئے۔اپنی خودنوشت ''تمنا بے تاب'' میں انہوں نے لکھا ہے۔

''ایم اے کا باقاعدہ نتیجہ نکلنے سے دو چار دن پہلے منشا یاد کا فون آیا کہ وہ تو سکینڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا ہے اور میری دو پرچوں میں کمپارٹمنٹ ہے۔اس خبر سے میرا دل بیٹھ گیا۔.....بہر حال تین چار دن کے بعد

Marfat.com

باقاعدہ رزلٹ آ گیا۔میری فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔کالج میں فرسٹ آیا تھا۔اس سال پہلی بار پرائیویٹ امیدواروں کو بھی امتحان دینے کی اجازت ملی تھی۔انور سدید، طاؤس بانہالی نے پرائیویٹ اور امجد اسلام امجد، جلیل عالی نے اورینٹیل کالج لاہور سے امتحان دیا تھا۔انور سدید نے گولڈ میڈل حاصل کیا''۔

ایم اے فرسٹ ڈویژن کرنے کا قدرت نے یہ انعام دیا کہ رشید امجد کو سی بی کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔کچھ عرصے کے بعد انہوں نے پی ایچ ڈی بھی کر لیا۔۲۰۰۴ء میں ریٹائر ہوئے تو پہلے نمل یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو بنائے گئے اور اب اسلامی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں اور ادب کے ساتھ تدریس کی خدمت بھی بجالا رہے ہیں۔

رشید امجد کی شخصیت کے کئی زاویئے ہیں۔ادب میں افسانہ نگاری کی صنف میں طلوع ہوئے اور تجریدی افسانے کو فروغ دینے والوں میں شمار کئے گئے۔ان کی تنقیدی جہت کو ڈاکٹر وزیر آغا اور راولپنڈی کی ادبی انجمنوں نے ابھارا اور مجلسی تنقید میں بھی اپنا نام پیدا کیا۔ادبی رسائل کی ادارت میں انہوں نے خصوصی مہارت ظاہر کی۔''پاکستانی ادب'' چھ جلدوں میں پیش کیا اور نمل یونیورسٹی سے ''تخلیقی ادب'' جیسا ضخیم رسالہ ہر سال شائع کرتے رہے۔

رشید امجد کا پہلا افسانوں کا مجموعہ ''کاغذ کی فصیل'' ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ مقبول اکیڈمی کو ان کی کتابیں ''یافت و دریافت''، ''بھاگے ہے بیاباں مجھ سے''، ''رویئے اور شناختیں''، ''میرزا ادیب شخصیت اور فن'' اور اس وقت تک کے افسانوں کی کلیات ''دشت نظر سے آگے'' چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔

ان کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہو چکی ہے ان کے فکر و فن پر ایم اے اور ایم فل کے پانچ مقالات لکھے جا چکے ہیں۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ان پر ایک طالب علم پی ایچ ڈی کی سطح کا کام کر رہا ہے۔صدر پاکستان نے ان کو ۲۰۰۶ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس

Marfat.com

ایوارڈ دیا تھا۔

رشید امجد دوستوں کے دوست ہیں۔انہیں اکثر لوگ ڈاکٹر وزیر آغا گروپ میں شامل شمار کرتے ہیں لیکن وہ احمد ندیم قاسمی سے بھی نیازمندی سے پیش آتے تھے۔اور فنون میں بھی افسانے بھیجتے رہتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرے دوست ہیں اور مقبول اکیڈمی کی کامیابی کیلئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

Marfat.com

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا شمار پاکستان کے ان فضلاء میں ہوتا ہے جو ساری عمر علم کی جستجو اور حق وصداقت کی تلاش میں کوشاں رہتے ہیں۔ وہ ہر سالکِ راہِ حق کے ساتھ چلتے اور ان کے خیالات اور تصورات سے فیض یاب ہونے کے لئے اس کی تصنیفات وتالیفات کا مطالعہ کرتے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے مطالعے کا تجزیہ بھی کرتے اور اگر اختلافی نکتہ پیدا ہوتا تو اس کے اظہار سے گریز نہ کرتے۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب بہت بڑے عالم تھے اور وہ محقق بھی تھے۔ ان کی تحقیق کا جوہر ان کے مضامین میں نکھر کر سامنے آجاتا تھا۔ وہ بالعموم انگریزی اخبارات میں اپنے مضامین چھپواتے تھے اور ان کے مخاطب وہ لوگ ہوتے تھے جو اُردو کی کتابیں کم پڑھتے ہیں، لیکن انگریزی کو فوقیت دیتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں اِسلام، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور پاکستان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور وہ پڑھے لکھے لوگوں کے خیالات کو منقلب کرنے کی کوشش کرتے تو بحث کو کبھی ناگوار صورت نہ ہونے دیتے۔

رفیع اللہ شہاب کو ان کے بچپن میں ہی علم وادب سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ ایک دن مجھے بتانے لگے کہ وہ میانوالی میں کالج میں پڑھاتے تھے، لیکن وہ خانقاہ سراجیہ کے کتب خانے

Marfat.com

میں عربی کی نایاب کتابیں پڑھنے کے لئے کندیاں جایا کرتے تھے،اس زمانے میں کندیاں اسٹیشن پر سواری دستیاب نہیں ہوتی تھی اور پروفیسر صاحب خانقاہ سراجیہ تک کا سفر پیدل کرتے تھے، وہ اس خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت خواجہ خان محمد صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ ان کی باتیں غور سے سنتے اور صرف ایک آدھ جملے میں ان کے خیالات کے برعکس اپنے علم کا مظاہرہ کر دیتے۔ پروفیسر صاحب کی بحث وہیں رُک جاتی۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے ریٹائر ہوئے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ اپنے ایک مخصوص مسلک کے انسان تھے، لیکن اعتدال اور توازن کو ہمیشہ قائم رکھا اور جب کبھی کوئی اختلافی نکتہ اُبھرا تو اس کا جواب خنک مزاجی سے دیا۔ پروفیسر صاحب کی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی علمیت کی نمائش نہیں کرتے تھے اور اپنی بات بھی انکسار سے کرتے تھے، اکثر بحث اخبارات میں کئی قسطوں میں چلتی رہتی۔ میرے ان سے ذاتی تعلقات کتابوں کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں ہی قائم ہوئے اور پھر یہ ان کی دوستی میں تبدیل ہو گئے۔ یہ خوشگوار تعلقات ان کی وفات تک قائم رہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب اِسلامی اصولوں کے مطابق معاملات میں کھرے تھے۔ ایک دفعہ جو معاملہ طے ہو جاتا وہ اس پر آخر دم تک قائم رہتے اور دوستی کو کسی قیمت پر بھی گزند نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ دوستانہ ماحول میں اگر فوری ضرورت لاحق ہو جاتی پیغام بھیج دیتے اور مجھے اس کی تعمیل میں ہمیشہ خوشی ہوتی۔ میں اس قسم کے معاملات میں بات کو ''حسابِ دوستاں در دل'' کے کھاتے میں رکھ کر بھول جاتا، لیکن پروفیسر صاحب یاد رکھتے اور جب کسی کتاب کی رائیلٹی کا سوال آتا تو وہ سابقہ معاملے کو اس میں شامل کر کے مجھے فارغ کر دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے سیرت نگاری کو اپنا موضوع بنایا تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر اپنی زندگی میں عمل کرنے کی کوشش کی اور اپنے عمل سے کئی لوگوں کو متاثر بھی کیا، لیکن کچھ لوگ ان کے تصورات سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ پروفیسر صاحب ان لوگوں سے زیادہ خندہ پیشانی سے ملتے اور ان کی بات کو زیادہ غور سے سنتے تھے۔ صبر و تحمل کا یہ حوصلہ اب کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔

Marfat.com

پروفیسر رفیع اللہ شہاب کی بہت سی کتابیں شائع کرنے کا اعزاز مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے۔ان میں سے چند کتب کے عنوانات یہ ہیں۔

سیرت ابن اسحاق... پیارے رسولؐ.....پیغمبرِ اسلام، رہنمائے تلاوتِ قرآن.....

عورتوں کے اسلامی حقوق.....پاکستان کے پچاس سال۔

اکثر ایسے ہی ہوتا کہ پروفیسر صاحب پہلے انگریزی میں کتاب لکھتے اور پھر اُردو پڑھنے والوں کے لئے اس کا ترجمہ بھی اُردو میں خود ہی کر دیتے۔اس سلسلے میں ان کی کتاب ''پاکستان کے پچاس سال'' کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔مقبول اکیڈمی سے انگریزی میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

1. Fifty Years of Pakistan..... Eminent Sihaba.
2. Islamic Civilization..... Allama Iqbal on Islamic Thought.
3. Genesis of Pakistan.

پروفیسر رفیع اللہ شہاب خردمندی کو فروغ دینے والے دانشوروں میں سے تھے۔تقابلی مطالعے میں ان کی گہری دلچسپی تھی اور وہ حزبِ اختلاف کے دلائل اقتباس کرنے کے بعد ان کا جواب مستند حوالوں سے پیش کرتے تھے،انہیں شکایت تھی کہ مغرب نے اسلام کے بارے میں بہت گمراہی پھیلائی ہے اور اس کے لئے ضعیف روایات کا سہارا لیا ہے۔افسوس، یہ مردِ خردمند جس کا نام رفیع اللہ شہاب تھا، زیادہ دیر زندہ نہ رہے اور اس دُنیا سے اُٹھ گئے، میں ان کے لئے مغفرت کی دُعا کر رہا ہوں۔

Marfat.com

رئیس احمد جعفری

اردو کے ممتاز مصنف، مؤرخ اور ناول نگار رئیس احمد جعفری سے میری ملاقات اتفاقیہ نہیں تھی، بلکہ میں اپنی ضرورت کے تحت ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ پندرہ روزہ رسالہ ''چودھویں صدی'' جاری کرنے سے میں ادبی صحافت کا آغاز تو کر چکا تھا۔ اور اس پرچے کو کامیاب بنانے کے لئے میں نے کئی تجربات بھی کئے۔ لیکن رسالہ مفت پڑھنے والوں کی کثرت کی وجہ سے میں ''چودھویں صدی'' کو خود کفیل نہ بنا سکا اور آخر تین چار سال کے بعد اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی معمولی تعلیم کے باوجود رسالہ ''چودھویں صدی'' کی اشاعت نے مجھے ادب کی اشاعت کے لحاظ سے خود اعتمادی عطا کی اور میں نے نشر و اشاعت کے میدان میں ہی اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا، میں چاہتا تھا کہ مجھے شروع میں ہی چند ایسی کتابیں چھاپنے کے لئے مل جائیں جنہیں اس دور کے پڑھنے والے پسند کریں اور کتاب خرید کر پڑھیں، محترم احسان دانش اور چند دوستوں نے مجھے اس دور کے مقبول ترین مصنف رئیس احمد جعفری سے ملاقات کا مشورہ دیا۔ جعفری صاحب ان دنوں میکلوڈ روڈ کے بغل میں واقع ٹیگور پارک میں رہتے تھے۔ ان کے اہلِ خانہ کراچی میں

Marfat.com

قیام پذیر تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ جعفری صاحب نے خود کھولا۔ باہر ایک دیہاتی وضع کے جوان کو کھڑا دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا ''کس کام سے آئے ہو''۔

میں نے کہا ''ایک ذاتی مشورے کے لئے حاضر ہوا ہوں''۔

مجھے ان کے چہرے پر ایک خاص قسم کی علمی متانت اور ادبی وقار نظر آیا۔ عینک کے شیشوں سے انہوں نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر اپنے ڈرائنگ روم میں لے آئے جس میں ہر طرف کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک پرانی وضع کے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

''تشریف رکھئے''

''میں تعظیماً کھڑا رہا کہ جعفری صاحب صوفے پر تشریف رکھیں تو میں ان کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جاؤں لیکن وہ اتنا کہہ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں کمرے کا جائزہ لیتا رہا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ واپس آئے تو انہوں نے چائے کی پیالی تھامی ہوئی تھی جو انہوں نے میرے سامنے رکھ دی اور کہا!

''لیجئے! پہلے چائے نوش کریں''۔

انہوں نے یہ بات کچھ اس محبت سے کی کہ میں نے اپنا مطلب مختصر الفاظ میں پیش کرنے میں تاخیر نہ کی۔ سن کر بولے ''کتاب چھاپنا تو مشکل کام نہیں لیکن کتاب فروخت کرنا بڑا محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ خاص طور پر کتاب تقسیم کرنے کے بعد کتب فروشوں سے پیسے وصول کرنا''..... مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ حوصلہ افزائی کی اور میں نے بھی جوانی کی ترنگ میں کہہ دیا کہ میں اپنے ادارے کا آغاز آپ کی کتابوں کی اشاعت سے کرنا چاہتا ہوں۔ اسی مقصد کے لئے میرے دوستوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے''۔

جعفری صاحب سن کر بڑے شائستہ انداز میں مسکرائے اور بولے۔

''آپ کے دوست بڑے سیانے نظر آتے ہیں''۔

اب میں نے اپنا مارکیٹ کا تجربہ بیان کرنا ضروری سمجھا ''آپ کے ناول خاص طور پر

Marfat.com

معاشرتی ناول بہت جلدی بک جاتے ہیں۔ مجھے بھی کوئی ناول عنایت فرمایئے"۔

مجھے یاد ہے کہ اس پہلی ملاقات میں جعفری صاحب نے اپنی شفقت مجھ پر خوب نچھاور کی، لیکن اپنے کسی ناول کا مسودہ دینے سے گریز کیا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت کوئی غیر مطبوعہ مسوّدہ موجود ہی نہ ہو، لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ جعفری صاحب نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ چنانچہ میں دو تین دن کا وقفہ ڈال کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ ان ملاقاتوں میں باتیں صرف جعفری صاحب کرتے اور میں مؤدبانہ سنتا رہتا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ مجھے ایک ناتجربہ کار جوان سمجھ کر میرا امتحان لے رہے ہیں کہ میں اپنے منصوبے میں کس قدر ثابت قدم ہوں۔ چند ملاقاتوں کے بعد انہوں نے مجھے ایک نہیں دو ناولوں کے مسودے عنایت کردیئے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں یہ مسودے لے کے انارکلی بازار میں احسان دانش صاحب کے پاس پہنچا اور انہیں کتابیں دکھائیں تو انہوں نے پیش گوئی کی۔

"ان دو ناولوں کی اشاعت آپ کے نئے ادارے کے لئے نیک فال ثابت ہوگی۔ جعفری صاحب کے ناول ان دنوں ناشروں کے لئے سونے کی کان ہیں"۔

جناب احسان دانش نے مشورہ دیا کہ کتاب اعلیٰ کاغذ پر چھاپو، کتابت، اعلیٰ اور غلطیوں سے پاک اور طباعت جاذبِ نظر اور دلکش ہونی چاہئے۔ پروف ریڈنگ پر خاص توجہ دو، اور کتاب کی قیمت کم رکھو"۔ اور آخری بات یہ کہ کتابوں کا اعزازیہ جعفری صاحب کی خدمت میں پہلے پیش کردو"۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جعفری صاحب نے تو اس کا ذکر تک نہیں کیا"۔ احسان دانش مسکرائے اور بولے "میاں، بڑے مصنف اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے اور ان کے لکھے کی قیمت کون ادا کرسکتا ہے"۔

میں نے احسان دانش صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دونوں ناول چھپ کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئے۔ میں ان کتابوں کے پہلے نسخے لے کر جعفری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ فرطِ مسرت سے مجھے گلے لگالیا۔ کتابوں کی ورق گردان کرتے جاتے

Marfat.com

تھے اور میری تحسین میں ایسے جملے بول رہے تھے جو میں نے پہلے کبھی سنے ہی نہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جعفری صاحب اپنی ادبی محنت کا سارا پھل میری جھولی میں ڈال رہے تھے۔

اب رئیس احمد جعفری میرے ادبی راہنما تھے۔ میں حاضر ہوتا تو اپنا کام چھوڑ دیتے اور اپنے ایک عقیدت مند کی حوصلہ افزائی کرنے لگتے۔ ان ملاقاتوں کے دوران ہی وہ بعض اوقات اپنی زندگی کے واقعات بھی سنانے لگتے۔ ان کا وطن سیتاپور تھا۔ لیکن پیدائش ۲۳ مارچ ۱۹۱۴ء کو لکھیم پور میں ہوئی' ان کے نانا نیاز احمد جعفری خمریات کے مشہور شاعر ریاض خیر آبادی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ رئیس احمد جعفری نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں تربیت پائی تھی۔ ۱۹۳۰ء میں طلبا کی ایک احتجاجی تحریک میں پیش پیش تھے۔ سزا کے طور پر انہیں دارالعلوم سے فارغ کر دیا گیا۔ جعفری صاحب دہلی آ گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا جہاں انہوں نے انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کی۔ مطالعے کا شوق بچپن سے تھا۔ فرمانے لگے۔ ''میں نے مضمون نگاری دارالعلوم ندوہ کے زمانے میں شروع کر دی تھی لیکن میرے مضامین رسالہ ''جامعہ'' میں چھپنے لگے تو بہت خوشی ہوئی اور پھر میں نے تصنیف و تالیف کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر سے انہیں گہری عقیدت تھی۔ جنوری ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس کے دوران مولانا محمد علی جوہر انتقال فرما گئے تو انہیں بڑا صدمہ ہوا اور انہوں نے مولانا محمد علی جوہر کی سوانح عمری لکھی جو ان کی پہلی کتاب تھی۔ یہ کتاب اتنی پسند کی گئی کہ رئیس احمد جعفری کو ''اخبار خلافت'' بمبئی کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ مولانا شوکت علی کی وفات کے بعد وہ ''خلافت'' سے الگ ہو گئے لیکن اب صحافت کی چاٹ لگ چکی تھی۔ انہوں نے ایک روزنامہ ''ہندوستان'' جاری کیا جو تحریکِ پاکستان کا زبردست وکیل تھا۔ تاہم انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ، محمد علی جناح کا پیغام اور اکھنڈ بھارت میں پاکستان کے مطالبے کو عوام کے دلوں میں اتارنے کے لئے اس دور کے ایک مقبول اخبار ''انقلاب'' کی ادارت سنبھالی۔ یہ اخبار بمبئی سے شائع ہوتا تھا اور مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کے اخبار ''انقلاب'' (لاہور) سے الگ اخبار تھا۔ سالک و مہر کا ''انقلاب'' پنجاب کی سیاست تک

Marfat.com

محدود تھا۔لیکن رئیس احمد جعفری کا اخبار پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا نمائندہ تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی کے ہوم منسٹر مرار جی ڈیسائی نے ان کا ناطقہ بند کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، پاکستان بن گیا تو جعفری صاحب ۱۹۴۹ء میں کراچی آ گئے۔اس دور میں انہوں نے روزنامہ ''خورشید'' اور ماہنامہ ''ریاض'' جاری کیا۔لیکن جب اخبار ''زمیندار'' لاہور کی ادارت پیش کی گئی تو انہوں نے یہ فریضہ قبول کرلیا۔جعفری صاحب اُدارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ساتھ بھی منسلک رہے اور انہوں نے اس ادارے کے لئے متعدد کتابیں تالیف کیں۔اس کے علاوہ اس ادارے کے رسالہ ''ثقافت'' کی ترتیب وتدوین میں بھی شریک تھے۔۱۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو ان کا انتقال لاہور میں ہوا لیکن ان کی تدفین کراچی میں ہوئی۔

رئیس احمد جعفری کی شفقت نے میرے ادارہ مقبول اکیڈمی کو ابتداء میں ہی مضبوط بنیاد فراہم کی۔میں اسے ان کا احسان عظیم سمجھتا ہوں کہ انہوں نے ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' کا ترجمہ کیا تو اس کی اشاعت کا اعزاز مقبول اکیڈمی کو عنایت فرمایا۔اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ادھر جعفری صاحب اس کا ترجمے کرتے جاتے' ادھر میں اس کی کتابت کراتا چلا جاتا تھا۔اس کا سرورق مشہور مصوّر ''جالی'' نے تیار کیا تھا۔کتاب چھپتے ہی پوری اردو دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔اس کا پہلا ایڈیشن چند دنوں میں فروخت ہو گیا۔پھر دوسرا اور تیسرا ایڈیشن چھپا۔یوں ایک ماہ میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔اشاعتی دنیا میں یہ پہلی کتاب تھی جس کے آرڈر ہمیں پورے ملک سے ٹیلی گراموں کے ذریعے موصول ہوتے رہے۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جعفری صاحب نے اس میں مولانا ابوالکلام کی ان باتوں کا مدلل جواب دے دیا تھا جو انہوں نے پاکستان کے خلاف لکھی تھیں۔مجھے یاد ہے کہ اس کتاب پر جن بڑی شخصیات نے مجھے تعریفی خطوط لکھے ان میں چودھری محمد علی' مشتاق احمد گورمانی' میاں ممتاز دولتانہ' خان عبدالقیوم خان' جناب ہاشم رضا' قدرت اللہ شہاب شامل تھے۔ایک دن اچانک دیکھا کہ کوثر نیازی صاحب میرے پاس بلڈنگ کی تیسری منزل پر تشریف لائے اور تبصرے کے لئے

Marfat.com

''آزادیٔ ہند'' کی دو جلدیں لے گئے۔اس کتاب نے مقبول اکیڈمی کو بے پناہ مقبولیت بخشی۔میں رئیس احمد جعفری کے اس احسان کو بھول نہیں سکتا کہ انہوں نے میرا ہاتھ اس وقت پکڑا جب میں اشاعتی میدان میں نو وارد تھا اور پھر مجھے اپنی کتابوں سے مسلسل نوازتے رہے۔

مجھے فخر ہے کہ ان کی چند مقبول کتابیں مثلاً ''قائداعظم اور ان کا عہد'' ''آزادیٔ ہند'' اور ''خطباتِ قائداعظم'' کے علاوہ ان کے تاریخی ناول ''یزید' یورش' تغلق، یورش اور شہاب الدین غوری میں نے اپنے ادارے سے چھاپے۔ان کے معاشرتی اور رومانی ناولوں کا وسیع ترین حلقہ الگ تھا۔کالجوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انہیں دلچسپی سے پڑھتے تھے۔اور ان کے ناول ہماری دکان سے پوری قیمت پر خریدنے کے لئے طلبا اور طالبات آتیں تو انہیں ''ڈسکاؤنٹ'' (رعایت) دے کر خوشی ہوتی تھی۔جعفری صاحب کا مؤقف یہ تھا کہ وہ اس نوع کے ناول لکھ کر نوعمر لڑکوں میں مطالعے کا ذوق پیدا کرتے ہیں۔

میں ایک عام آدمی کی حیثیت سے لوگوں کے نفسیاتی مطالعے کا دعویٰ نہیں کرتا۔میں صرف یہ دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا ادیب میرے جیسے عام لوگوں سے کس طرح ملتا ہے اور اس کا لین دین کیسا ہے؟ اس لحاظ سے رئیس احمد جعفری بلاشبہ ایک بڑے انسان تھے۔محبت کرنا ان کی عادت تھی۔انسان دوستی ان کی فطرت میں تھی۔وہ سیاست آشنا ادیب تھے لیکن کبھی اپنے کسی مخالف پر منفی تنقید نہیں کی۔وہ پاکستان کو مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ سمجھتے تھے اور قائدِ اعظم کے اس احسانِ عظیم کا تذکرہ کرتے کہ وہ آزاد وطن لے کر دے گئے ہیں تو ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو جاتی لیکن ملال کرتے کہ سیاستدانوں نے اس ملک کی حفاظت کا حق ادا نہیں کیا۔جعفری صاحب کو اپنے ملک سے بے پناہ محبت تھی اور وہ اس آرزو میں ہی اس دنیا سے اٹھ گئے کہ کشمیر کو آزاد دیکھ سکیں۔

میں آج اپنے محسن کو یاد کر رہا ہوں تو دل خوش ہو رہا ہے۔اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

Marfat.com

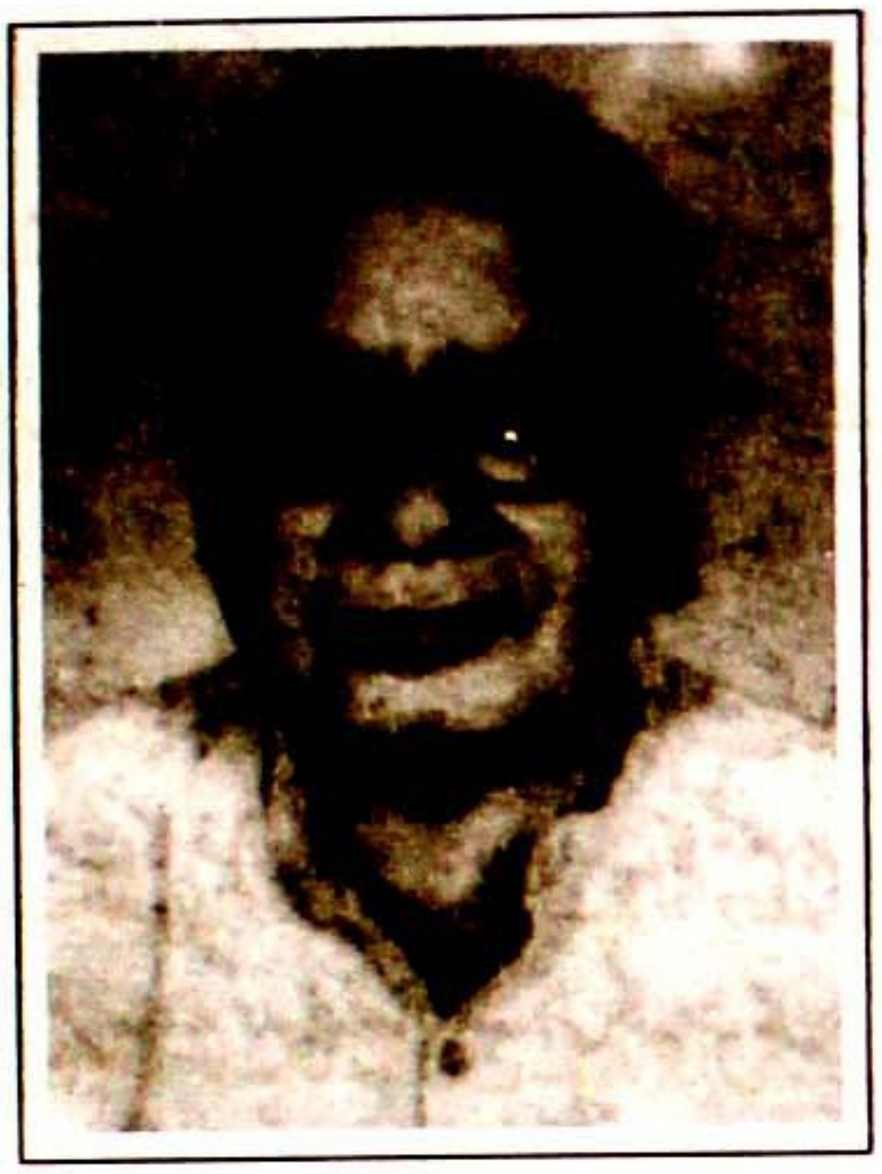

ستار طاہر

ستار طاہر کا نام آئے تو ہمارے سامنے ایک ایسا محنت کش انسان آجاتا ہے جس کا ذکر مرزا غالب نے اس مصرع میں کیا ہے۔

''ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے''

ستار طاہر تیشے کا مزدور نہیں بلکہ قلم کا مزدور تھا۔ میرے دوست اظہر جاوید نے مجھے بتایا کہ ستار طاہر جب لاہور آیا تو مفلس و قلاش تھا، لیکن اس نے تعلیم اتنی حاصل کر لی تھی کہ اُردو کے ساتھ انگریزی بھی پڑھ سکتا تھا۔ روزی روٹی کمانے کے لئے اس نے ایک وکیل کے دفتر کے باہر چٹائی بچھائی اور اس پر سائلوں کی عرضیاں لکھنے لگا۔ اسی دوران اظہر جاوید سے کسی طرح اس کی دوستی قائم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق ستار طاہر کی ترقی کی کوشش شروع کر دی۔ چھوٹے چھوٹے کئی منافع کے کام کرانے کے بعد اس کو ترجمے پر لگایا اور ایک دن اظہر جاوید حیران ہو گیا کہ ستار طاہر کے اندر تو ایک افسانہ نگار موجود تھا۔ تھوڑے سے عرصے میں ستار طاہر کا نام چمکنے لگا، اس نے کئی ڈائجسٹ پرچوں کی ادارت کی۔ راوی کہتا ہے کہ بعض اوقات تو سارا پرچہ ستار طاہر خود لکھ ڈالتا تھا۔ سرکاری رسالہ ماہنامہ ''کتاب'' کے ایڈیٹر بنائے گئے، اس کے ترجمہ شدہ

Marfat.com

ناول کئی اشاعتی اداروں سے چھپنے لگے۔ وہ تخلیقی فنکار تھا، لیکن اس نے ترجمے کو ہی اپنے فن کا خصوصی شعبہ بنالیا اور انگریزی رسائل سے سیاسی مضامین بھی ترجمہ کرنے لگا۔ سچ بات یہ ہے کہ ستار طاہر نے جو کچھ لکھا اظہر جاوید نے اسے ''تخلیق'' میں چھاپا۔ ''تخلیق'' میں ستار طاہر کا مستقل کالم فٹ نوٹس (Foot Notes) چھپتا تو ادبی دُنیا میں قیامت آجاتی۔ منافقت سے عاری اس کالم میں ستار طاہر سچ اور صرف سچ لکھتا تھا جو بڑا کڑوا ہوتا تھا اور کسی کو پسند نہیں آتا تھا۔ ''تخلیق'' کے دفتر میں شکایتوں کے انبار لگ جاتے۔ اظہر جاوید سب کی بات سنتا اور کہتا آپ ستار طاہر کا جواب لکھیں، میں اسے بھی شائع کروں گا۔

میں اس بات کا بھی عینی شاہد ہوں کہ ستار طاہر کی ہتھیلی میں کئی سوراخ تھے، ادھر اسے اپنی کسی تحریر کا معاوضہ یا سرکاری دفتر سے ماہانہ تنخواہ ملتی، ادھر وہ اس آمدنی کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں غلطاں ہو جاتا۔ پیسہ ہاتھ کی موری سے نکل جاتا اور ستار طاہر پھانگ ہو جاتا۔ اس دوران اس کی شادی ہوگئی اور شادی ہوگئی تو بچے بھی پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنے بچوں سے بہت پیار کرتا تھا اور ان کی خاطر داری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا، لیکن مفلوک الحالی ختم نہ ہوئی اور سچی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں صرف قلم کی کمائی پر انحصار کر کے گھر بار چلایا نہیں جا سکتا، لیکن ستار طاہر کے پاس قلم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ نئے نئے منصوبے بناتا، یا انہیں کاغذ پر اُتارتا اور پھر انہیں بیچنے کے لئے نکل کھڑا ہوتا۔

ستار طاہر نظریاتی طور پر ذوالفقار علی بھٹو کا عقیدت مند تھا اور پیپلز پارٹی کا ''روٹی کپڑا اور مکان'' کا نعرہ اس کے دل کے قریب تھا۔ ایک پی پی پی ورکر کی حیثیت میں ستار طاہر نے اس پارٹی کا دل و جان سے کام کیا کہ یہ پارٹی غریبوں کے لئے انقلاب لانے کا دعویٰ کر رہی تھی اور بھٹو صاحب انقلاب کی علامت تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب بھٹو کو آمر ضیاء الحق نے اپنے شکنجے میں پھانس لیا تو ستار طاہر ہر وقت فکر مند رہنے لگا تھا اور جب اسے پھانسی دے دی گئی تو ستار طاہر کئی دن روتا رہا کہ اس کے

Marfat.com

لیڈر کو ایک فوجی آمر نے مار ڈالا تھا۔ پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔ پھر ستار طاہر نے قلم سنبھال لیا اور ذوالفقار علی بھٹو پر کتابیں لکھنے لگا، اب اس کے ادبی موضوعات میں سیاست بھی شامل ہوگئی تھی۔ پھر جب وزیراعظم محمد خان جونیجو کے دور میں محترمہ بے نظیر بھٹو وطن واپس آئیں اور ان کا بے مثال خیر مقدم کیا گیا تو ستار طاہر کی اُمیدیں پھر زندہ ہوگئیں، اب اس نے دخترِ مشرق کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا اور بے نظیر بھٹو پر جم تھام لیا۔

ستار طاہر قلم کا مزدور تھا۔ وہ محنت میں یقین رکھتا۔ مشقت کا کام اس کو تر و تازہ کر دیتا تھا۔ میری ملاقات ستار طاہر سے ہوئی تو وہ شہرت کی بہت سی سیڑھیاں چڑھ چکا تھا۔ لاہور ہی نہیں پورے پاکستان میں اس کے نام کا سکہ چلتا تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تنگدستی کا ہمیشہ شکار رہا۔ میرے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ستار طاہر کی خوبی یہ تھی کہ وعدے کا پاس کرتا تھا، اس کا ایک ہی مطلب ہوتا کہ اسے کتاب کا اعزازیہ پہلے پیش کر دیا جائے۔ میں نے اس کی متعدد کتابیں چھاپی ہیں۔ ان میں غریب کی جورو..... محبت کے چار ناول..... آزادی سے پہلے..... عالم اسلام کا فکری انقلاب..... پاکستان کا سیاسی سفرنامہ..... تعزیت نامے..... اور پاکستان کا مستقبل وغیرہ شامل ہیں اور میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ستار طاہر کو اپنا اعزازیہ مانگنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ میں نے اس کے وقار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس نے بھی ہمیشہ کوشش کی کہ مقبول اکیڈمی کو اپنی اچھی کتاب پیش کرے۔

ستار طاہر اُردو نثر پر بڑی قدرت رکھتا تھا، اس کا اسلوب دل نشین تھا۔ وہ معاشرے کو تنقیدی نظر سے دیکھتا اور پھر اپنے مشاہدے کو افسانے یا ناول کا روپ دیتا، بعض اوقات وہ اخبارات سے سکینڈل بھی اچک لیتا اور اس کو مرکزی موضوع بنا کر ناول لکھ ڈالتا..... ستار طاہر بائیں بازو کے اشتراکی خیالات رکھتا تھا، لیکن آخری دنوں میں وہ اپنے بائیں بازو کے دوستوں سے دل برداشتہ ہوگیا، کیونکہ سب اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے مجیب الرحمٰن شامی کے ادارے میں پناہ لی جو دائیں بازو کے مشہور صحافی ہیں۔ ستار طاہر ''قومی ڈائجسٹ'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے اس پرچے کی نظریاتی پالیسی کو قبول کیا، لیکن شاید وہ اس ''زوالِ آدمِ خاکی'' پر اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا اور پھر ایک دن اچانک اس کے دل کی دھڑکن

Marfat.com

رُک گئی اور وہ اس دُنیا سے اُٹھ گیا۔ کرشن نگر لاہور سے اس کا جنازہ اُٹھا تو اس میں ستار طاہر کے وہ دوست نظر نہ آئے جو بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔ ستار طاہر کے پسماندگان میں ان کی بیوہ، ایک بیٹا اور بیٹیاں شامل تھیں۔ بچے چھوٹے تھے، ان کا کفیل دُنیا سے اُٹھ گیا تھا۔ یہ لاہور کے ایک مشہور قلم کار کی موت تھی، جس کی خبر پی ٹی وی پر نشر نہیں ہوئی۔

Marfat.com

سعید بدر

سعید بدر اس محنت کش انسان کا نام ہے جس نے اپنی ہمتوں کو کبھی پست نہیں ہونے دیا اور زندگی کی صعوبتوں کا مقابلہ کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا' بلکہ یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ جب وہ کسی مشکل میں گرفتار نہ ہو اور وقت آسودگی سے گزر رہا ہو تو وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی تمام قوت اسوۂ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرتے ہیں جنہوں نے اپنی مکی زندگی میں اپنے مخالفین کا سامنا کیا اور بالآخر ہجرت کے بعد مکہ میں کامرانی سے داخل ہوئے ان کا غارِ حرا کا پیغام ربانی پوری دنیا میں اشرف ترین نظام ہے۔ سعید بدر پر جب مشکل آتی ہے تو وہ نعت نبویؐ کہنے لگتے ہیں اور مشکل حل ہونے لگتی ہے۔ وہ شاعر ہیں لیکن انہوں نے غزل اور نظم کی شاعری نہیں کی۔ ان کا فن صرف حمد و نعت کے لئے وقف ہے۔ انہوں نے قلم و قرطاس سے رشتہ جوڑا تو صحافت کو اپنا پیشہ بنایا اور یہاں بھی انہوں نے آسان راہوں کو قبول کرنے کی بجائے مشکل راستے اختیار کئے اور ایسی تجرباتی صحافت کی جو آج کے نئے صحافیوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ چنانچہ انہیں بلند پایہ نعت نگار کا درجہ حاصل ہے تو وہ صحافت میں ممتاز شمار کئے جاتے ہیں۔

سعید بدر مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور میں ۱۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان

Marfat.com

کے والد سائیں حکیم محمد یعقوب منیر قادری اعلیٰ پائے کے طبیب، دینی اور روحانی پیشوا اور تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ دین اسلام سے محبت اظہار کے لئے ادب سے تعلق اور زمانہ شناسی کے لئے سیاست آشنائی انہیں ورثے میں ملے۔

تحریک پاکستان کے دنوں میں فیروز پور میں مسلم لیگ کا پرچم اٹھا کر اور بچوں کا ہجوم جمع کر کے نعرے لگایا کرتے تھے..... ''لے کے رہیں گے پاکستان..... ''''بن کے رہے گا پاکستان''..... اور بالآخران بچوں کی معصوم دعائیں کامیاب ہوگئیں اور پاکستان بن گیا لیکن المیہ یہ ہوا کہ فیروز پور کو بھارت میں شامل کر دیا گیا اور مقصد گنڈا سنگھ والا ہیڈ ورکس پر قبضہ کرنا تھا۔ چنانچہ سعید بدر کے خاندان کو ہجرت کرنی ناگریز ہوگئی اور وہ اپنے والد گرامی کیساتھ چھانگا مانگا کے قریب دیر سنگھ والا نامی گاؤں میں جو تحصیل چونیاں میں ہے، آباد ہو گئے۔

سعید بدر کو عربی، فارسی اور اردو کا ذوق اپنے والد محترم سے ورثے میں ملا تھا۔ پاکستان آ کر انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹیل کالج میں دو سال تک ایم اے کی تعلیم حاصل کی اور نہ صرف کلاسیکی ادب کا مطالعہ مکمل کیا بلکہ جدید اردو ادب سے بھی پوری شناسائی حاصل کی۔

اس دور میں انہیں علامہ اقبالؒ کے کلام سے محبت پیدا ہوئی، علامہ اقبال کے کلام ہی نے ان کے دل میں مرشد رومیؒ کی محبت پیدا کی۔ انہوں نے اپنی زندگی ان دونوں کے مطالعے کے لئے وقف کر دی اور ان پر کئی گراں قدر تحقیقی مقالے لکھے جو ملک کے معروف ادبی رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔

یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم اور ادب و صحافت میں دلچسپی کی وجہ سے سعید بدر کو واپڈا میں شعبہ تعلقات عامہ میں پبلک ریلیشنز افسر کی باوقار ملازمت مل گئی۔ اس عہدے پر انہوں نے واپڈا کے زیر تعمیر منصوبوں کی پوری معلومات شفاف انداز میں عوام تک پہنچانے کے لئے رسالہ ''برقاب'' کی ادارت کی اور ''واپڈا خبر نامہ'' مرتب کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں

Marfat.com

نے محسوس کیا کہ ''واپڈا'' میں ''برقاب'' اور ''واپڈا خبرنامہ'' کا صحافتی میدان محدود ہے۔اسی دور میں اخبار ''جنگ'' لاہور سے شائع ہونے لگا تھا۔کہتے ہیں کہ میر خلیل الرحمٰن نے خبر نگاروں کے ساتھ فیچر نگار صحافیوں کو زیادہ اہمیت دی انہوں نے ''برقاب'' میں سعید بدر کے فیچر دیکھے تھے۔چنانچہ انہیں بھی ''جنگ'' کے میگزین کے شعبے میں اچھے مشاہرے پر منتخب کرلیا۔سعید بدر کی صحافتی خدمات کو ادبی حلقوں میں سراہا گیا لیکن ''جنگ'' کی مقصدی صحافت ان کی منزل نہیں تھی۔اس لئے وہ صرف ایک سال کے بعد اخبار ''امروز'' میں چلے گئے جہاں پہلے ان سے نیوز روم میں کام لیا گیا اور پھر ان کی صلاحیتوں سے بھرپور کام لینے کے لئے انہیں ''جمعہ میگزین'' کا انچارج بنا دیا گیا۔اسی دور میں امروز کی پیشانی سے ایک کیمونسٹ اخبار ہونے کا داغ دھل چکا تھا۔سعید بدر نے امروز میگزین کے دینی پہلو کو اہمیت دی اور ۴۸ صفحات پر مشتمل ضخیم ''رحمت العالمینؐ نمبر'' شائع کیا جس کی دھوم پورے ملک میں مچ گئی۔وطن عزیز میں اس نمبر کی پذیرائی وسیع پیمانے پر ہوئی' ملک کی مختلف تنظیموں نے سعید بدر کو اعزازات سے نوازا اور ان کی خدمت میں گولڈ میڈل پیش کئے۔اس خاص نمبر کی اہمیت آج بھی استوار ہے۔میلاد النبیؐ کے موقعہ پر جب اخبارات ''رحمت العالمین نمبر'' چھاپتے ہیں تو سعید بدر کے مرتب کئے ہوئے اس خاص شمارے سے خصوصی مدد لیتے اور اس کے مضامین مکرر چھاپتے رہتے ہیں۔سعید بدر کہتے ہیں کہ جب نئے اخبارات میں یہ مضامین دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی اس دینی خدمت کی پذیرائی پر بہت خوشی حاصل ہوتی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو، میاں محمد، بابا فرید، فیض احمد فیض اور علامہ اقبالؒ پر بھی امروز کے معلومات افزا ایڈیشن چھاپے جنہیں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

جناب سعید بدر کی ایک اور خدمت یہ ہے کہ انہوں نے قوم کی تعلیمی حالت کو سنوارنے میں بھی گہری دلچسپی لی۔ان کی مساعی سے حضرت عائشہ صدیقہ ڈگری کالج قائم ہوا اور طالبات کو جدید سائنسی آلات کی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کیلئے انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ کمپیوٹر کالج بھی قائم کیا جو اب محکمہ اوقات کی تحویل میں کامیابی سے چل رہے ہیں۔ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو دیکھ

Marfat.com

کر لاہور کے معروف میاں خاندان نے اپنی قائم کی ہوئی پبلک ویلفیئر سوسائٹی باغبانپورہ میں ان کی خدمات سے استفادہ کیا اور انہیں اس ادارے کا سیکرٹری جنرل مقرر کر دیا جہاں وہ اب تک خدمات انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں تنظیم ''پاکستان پریس کونسل'' کے عہدے دار ہونے کے علاوہ وہ ''تھنک ٹینک'' کے چیئرمین بھی ہیں۔

متذکرہ بالا سماجی سرگرمیوں میں بے پناہ مصروفیت کے باوجود سعید بدر اپنے ادبی اور صحافتی فرائض سے کبھی فارغ نہیں ہوئے۔ وہ ایک طرف اخبار ''امروز'' کے ساتھ (جواب بند ہو چکا ہے) اپنے حقوق کا مقدمہ عدالت میں لڑ رہے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے متعدد رسائل کے ادارتی فرائض اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ انہوں نے گزشتہ بیس سال کے عرصے میں ماہنامہ ''رموز''.....ہفت روزہ جہاں نما..... ہفت روزہ ''اخبار جواں''..... ماہنامہ ''ساحل رنگ''.....ہفت روز سب کا..... ماہنامہ ''خلش''..... ماہنامہ ''دلیل راہ''..... اور ماہنامہ ''انوار حیدر'' میں ادارت کی خدمات انجام دیں اور ان دنوں اپنا رسالہ پندرہ روزہ ''مخزن اقبال'' بھی نکال رہے ہیں جو پیغام اقبال کے فروغ میں ممد و معاون ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہے کہ سعید بدر کی زندگی کئی جہات میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی خدمات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ انہوں نے پاکستانی معاشرے کے اہم ترین کردار ''ماں'' کے موضوع پر تین صد صفحات کی ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں ملک کی تمام زبانوں کے شعرائے کرام کی نظمیں شامل ہیں۔

ان کی ایک کتاب ''روشنی کا سفر'' اردو سائنس بورڈ نے شائع کی۔ ان کی ایک کتاب ''اقبال شناسی اور ہمایوں'' کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی کے ادارے بزمِ اقبال سے چھپی۔

ایئر مارشل ریٹائرڈ اصغر خان کی پہلی کتاب کا ترجمہ انہوں نے ''پاکستان کا مستقبل'' کے نام سے کیا۔ اب اصغر خان کی نئی کتاب ''میری سیاسی زندگی کے سنگ ہائے میل'' کا ترجمہ بھی سعید بدر نے ہی کیا ہے اور ان کی ترجمہ کردہ نئی کتاب ''میری سیاسی جدوجہد'' ہے۔ عبدالواسع

Marfat.com

ثاقب سلمانی ایک بزرگ شاعر تھے۔ سعید بدر نے ان کا کلیات مرتب کیا اور ان کی بے شمار نظمیں جو رسائل میں گم تھیں ڈھونڈ نکالیں۔ نعت کی ایک کتاب ''دِل دِل مدینہ'' میرے ادارے مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئی ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ سعید بدر سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی تھی لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ میں سعید بدر سے ازل سے آشنا تھا۔ وجہ یہ کہ مشرقی اخلاقیات کی جن اقدار کو وہ عزیز جانتے ہیں، انہیں اقدار پر میں نے اپنی زندگی میں عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا ہم دونوں کی روحانی ہدایات کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ سعید بدر دوستوں کے دوست ہیں لیکن وہ دشمنوں کے دشمن کبھی نظر نہیں آئے۔ وہ نسبتیں قائم رکھنے اور دوستیاں نبھانے والے ادیب ہیں، ان کا رابطہ نوجوانی کے ایام میں ہمایوں کے مدیر میاں بشیر احمد سے ہوا تھا۔ یہ تعلق ان کی اگلی نسل میں چلا گیا۔ چنانچہ جب میاں منظر بشیر پر مشکل وقت آتا تو وہ سعید بدر کے گھر میں پناہ گزین ہو جاتے تھے اور سعید بدر ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میاں منظر بشیر کو دیکھ کر انسان کو اپنی زندگی سنوارنے کا سبق ملتا ہے جو شخص ایک وقت میں پورے لارنس روڈ کا مالک تھا۔ جب ادبار کی زد میں آیا تو کرائے کے مکان کو بھی ترس گیا۔ سعید بدر کے دل میں گزشتہ قریباً پون صدی کی تاریخ دفن ہے۔ بیوروکریسی، صحافت اور سیاست کے صدہا کرداروں کے ظاہر و باطن سے وہ آشنا ہیں، اور کبھی تنہائی میں ہم اکٹھے ہوں تو وہ انہیں حافظے کی لوح سے چھانٹ چھانٹ کر سناتے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا نفسِ مطمعنہ رکھنے والے انسان بہت کم دیکھے ہیں۔ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی فرق نہیں۔ ان کی شخصیت کے آئینے سے ایک ہی رنگ کی تصویر جھلکتی ہے اور یہ تصویر سعادت آثار ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی کے ساتھ مہلت عطا فرمائے تاکہ وہ مزید علمی ادبی اور تخلیقی کام کر سکیں۔ (آمین)

Marfat.com

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر کا ادبی سفر ملتان سے شروع ہوا تھا، لیکن وہ اس سے قبل کئی گھاٹوں کا پانی پی چکے تھے اور ملتان میں زیادہ دیر قیام نہ کر سکے۔ لاہور نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبۂ اُردو میں لیکچرار مقرر ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے پروفیسر بن گئے۔ اس تمام عرصے میں وہ مصنف کی حیثیت میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ ان کا افسانہ ''بکری'' ملتان میں قیام کے دوران چھپا تھا، لیکن اس کا جنسیاتی زاویہ زیادہ مشہور ہوا اور سلیم اختر صاحب کا نام سعادت حسن منٹو کے ساتھ لیا جانے لگا۔ سلیم اختر نے رسالہ ''نصرت'' میں نفسیاتی مضامین سے پہلی شہرت حاصل کی۔ ان کے اس قسم کے مضامین کی حوصلہ افزائی جناب حنیف رامے نے کی، جو ان دنوں رسالہ ''نصرت'' کی ادارت کرتے تھے اور اب یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ''نصرت'' میں اشاعت ملنے لگی تو سلیم اختر صاحب نے نفسیات کا مطالعہ اپنے ذوق و شوق کے مطابق کرنا شروع کر دیا اور فرائیڈ کے اثرات کو اپنے مضامین میں بھی خوب استعمال کیا۔ حتیٰ کہ ''نفسیات'' ہی ان کی پہچان بن گیا اُردو میں فرائیڈ کا نام بعد میں اور

Marfat.com

سلیم اختر کا پہلے آتا ہے اور اس موضوع پر ہی انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی اور وہ سلیم اختر سے ڈاکٹر سلیم اختر بن گئے۔

سلیم اختر کی پہلی محبت اُردو افسانے کے ساتھ تھی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں محبت کو اہمیت دی انہوں نے جنس کے تمام زاویوں کو جرأت مندی سے افسانوں کا موضوع بنایا اور اپنے پڑھنے والوں کو چونکایا۔ دوسری طرف ان کے ادبی تشخص کو ان کی تنقید نے زیادہ مستحکم کیا۔ تنقید میں بھی ان کا نفسیاتی تجزیہ ہی اہمیت رکھتا ہے اور وہ افسانہ اور افسانہ نگاروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہمارے ادب میں شاعری کی تنقید زیادہ لکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اُردو افسانے کو اپنی تنقید میں فوقیت دی اور کئی کتابیں پیش کیں، ان کی ایک اور حیثیت نظریاتی نقاد کی بھی ہے۔ انہوں نے تنقید کے مختلف دبستانوں پر ایک جامع کتاب لکھی جو اب طلباء کے لئے رہنما کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

سلیم اختر نے ابتداء میں ڈاکٹر عرش صدیقی کی معاونت سے اپنے ادبی سفر کو فروغ دیا، وہ اُردو اکیڈمی ملتان میں مضمون پڑھتے تو اس پر سرگرم بحث کی جاتی جس کو عرش صدیقی صاحب عالمانہ انداز میں سمیٹتے تھے۔ انہی دنوں ان کے مضامین ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' میں شائع ہونے لگے تو ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ سلیم اختر کی ایک کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا۔ انہوں نے اپنی کتاب ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں ''دبستانِ سرگودھا'' کو متعارف کرایا اور ''انشائیہ'' کی تعریف پیش کی۔ ان دنوں لاہور میں بعض لوگ تو یہ بھی کہتے تھے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کو سلیم اختر نے ہی انشائیہ کا بانی قرار دیا تھا، میں نے اظہر جاوید اور انور سدید سے پوچھا تو انہوں نے مشتاق احمد یوسفی کا نام لیا جنہوں نے وزیر آغا کی کتاب ''چوری سے یاری تک'' کا پیش لفظ لکھا ہے اور پھر ان کے مضامین احمد ندیم قاسمی صاحب کے رسالہ ''فنون'' میں چھپنے لگے اور احمد ندیم قاسمی صاحب نے ڈاکٹر سلیم اختر کی پذیرائی کھلے

Marfat.com

بازوؤں سے کی اور انہیں اپنے دل کے قریب رکھا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر محنت کے عادی تھے۔ وہ اپنی دُنیا آپ بنانے میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے تھے۔ ''اوراق'' اور ''فنون'' تو ان کی اشاعت کا وسیلہ تھا۔ ایک مرتبہ میرزا ادیب مرحوم سے ان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر سلیم اختر کی انہوں نے تحسین و تعریف کی کہ ان کی ادب میں دلچسپی بے حد سنجیدہ ہے اور وہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے، بلکہ ہر وقت لکھتے رہتے ہیں اور جب وہ لکھ نہ رہے ہوں تو کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ میرزا ادیب نے یہ بات بھی بتائی کہ ڈاکٹر سلیم اختر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔

اب مجھے ایک ذاتی بات عرض کرنے کی اجازت بھی دیں اور وہ یہ کہ سلیم اختر شجر سے پیوستہ رہنے کی جو عادت رکھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے ثابت ہوتی ہے کہ ان کی کتابیں لاہور کے صرف ایک ادارے سے شائع ہوتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے اس ادارے کے ساتھ اور ناشر نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری کا سلسلہ قائم رکھا ہے۔ میں نے ایک کتاب ''اہل قلم کے خطوط'' تالیف کی تو آرزو پیدا ہوئی کہ اس کا پیش لفظ ڈاکٹر سلیم اختر تحریر فرمائیں۔ مقبول اکیڈمی سے ان کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی، اس لئے میں ڈر رہا تھا کہ میری گزارش کو خدا جانے کس انداز میں لیں۔ میں ان کے درِ دولت پر حاضر ہوا تو بڑی خوش دلی سے ملے اور میری کتاب کا پیش لفظ لکھنے کا وعدہ بھی کر لیا اور خوبی کی بات یہ کہ چند دنوں میں مجھے یہ پیش لفظ لکھ کر باغ باغ کر دیا۔ اب اس کتاب پر تبصرہ ہوتا ہے تو اس میں ڈاکٹر سلیم اختر کے پیش لفظ سے زیادہ استفادہ کیا جاتا ہے۔ میں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا ذاتی سطح پر احسان مند ہوں، وہ میری نظر میں واقعی عظیم ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان نے ان کو ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' دیا ہے اور ان کے ادبی کام پر بھارت میں پی ایچ ڈی کی جا چکی ہے۔

Marfat.com

سید شبیر حسین شاہ زاہد

سید شبیر حسین شاہ زاہد پیشے کے لحاظ سے تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں، لیکن ان کا بنیادی شوق تصنیف و تالیف ہے اور انہیں عشق کتاب سے ہے۔ کہتے ہیں کہ میں بیمار پڑ جاؤں تو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ شروع کر دیتا ہوں، چند لمحوں کے بعد بیماری بھول جاتا ہوں اور مطالعہ سیراب کر دیتا ہے تو بیماری بھاگ چکی ہوتی ہے۔ ادب میں انہوں نے کسی کو اُستاد نہیں کیا، کسی کو رہنما نہیں بنایا۔ یہ محبت ان کے دل میں پرائمری درجے میں پیدا ہوئی اور پھر خود بخود پروان چڑھتی چلی گئی اور اب ایک تن آور درخت بن چکی ہے۔

سید شبیر حسین شاہ نے اپنا مسکن پُر ہجوم شہروں سے دُور ایک ایسی بستی کو بنایا ہے جسے سکھ ۱۹۴۷ء میں ترک کر گئے تھے، لیکن اس بستی کو سکھ مذہب کے بانی کے نام سے موسوم کیا گیا اور گوردوارے کی زیارت کے لئے ہر سال سکھ آتے ہیں تو اس قصبے کی رونق بڑھ جاتی ہے اور تاریخ زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ ننکانہ صاحب کی بستی ہے، جہاں شبیر حسین شاہ ۵ مارچ ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان کے مضامین میں سائنس شامل تھی، لیکن اس دوران وہ اسلام کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ یہ دین انہیں وراثت میں ملا تھا، لیکن کہتے ہیں

Marfat.com

کہ میں نے اس کی عالمگیریت کا اثبات اپنے مطالعے سے کیا۔ انہوں نے ۱۹۹۸ء تک تین ایم اے کئے۔ ان کے ایم اے کے مضامین میں اِسلامیات، تاریخ اور عربی کے مضامین شامل تھے۔

سید شبیر حسین شاہ نے عملی زندگی پاکستان بحریہ میں ملازمت سے شروع کی، اپنے فرائضِ منصبی سے فارغ ہونے کے بعد وہ دینی، علمی اور اصلاحی کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ نیوی کے جوانوں کو کتاب کی طرف راغب کرنے کے لئے انہوں نے اِسلام آباد میں ایک لائبریری کے ساتھ ایک تحقیقی اکیڈمی بھی قائم کی۔ افواجِ پاکستان کے رسالہ ''ہلال'' میں معاون مدیر کی خدمات انجام دیں اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''نیوی نیوز'' کی ادارت بھی ان کا ایک کارنامہ ہے۔ محکمہ تعلیم نے انہیں لیکچرار کی پوسٹ کے لئے منتخب کر لیا تو انہوں نے نیوی کی ملازمت ترک کر دی اور ننکانہ آ گئے اور یہاں بھی پہلے ایک لائبریری کی بنیاد رکھی اور پھر تحقیقی اکیڈمی قائم کی۔ کالج کے رسالہ ''مضراب'' کی ادارت کر کے انہوں نے اس معروف مقام کو ادب کی روشنی سے منور کیا اور طلباء کے ادبی ذوق کو سنوارا۔ ان کا اہم کام یہ بھی ہے کہ انہوں نے کالج کے طلباء اور طالبات کے اِسلامیات (اختیاری) کے لئے ''مصباح الاسلام'' کے عنوان سے سلسلۂ کتب تالیف کیا۔ مڈل سکول کے طلباء کے لئے ''نمرہ انگلش'' اور ''آئیڈیل انگلش'' کتابیں لکھیں۔ ''مطالعہ تعلیماتِ اِسلام'' میں سوال و جواب کا طریق اختیار کیا جو طلباء میں بہت مقبول ہوا۔

متذکرہ خدمات کی نوعیت تعلیمی ہے۔ سید شبیر حسین شاہ زاہد کا بنیادی مزاج تحقیقی ہے اور انہوں نے مشاہیر اِسلام کی زندگی کے حالات کی تحقیق میں بہت سا وقت صرف کیا ہے۔ ''تجلیاتِ سیرۃ النبی'' صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ فخر کا اظہار کرتے ہیں اور اسے اپنا توشۂ آخرت قرار دیتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں کہ اس کتاب کا موضوع سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے، انہوں نے ایک کتاب حضرت مجدد الف ثانیؒ پر بھی تالیف کی ہے۔ سیرت کی کتابوں پر انہیں وزارت مذہبی امور نے اعلیٰ پائے کی مقالات نویسی پر تین سال تک تعریفی اسناد اور نقد انعام سے

Marfat.com

نوازا۔ سید شبیر حسین شاہ کا قلم رواں دواں ہے اور وہ دینی اور علمی تالیفات میں مصروف ہیں۔

میں ان خوش نصیب لوگوں میں شامل ہوں جو سید شبیر حسین شاہ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ میرا ان سے تعارف نہیں تھا، انہوں نے میری ناچیز تالیف ''سفر جاری ہے'' پڑھی تو اس پر بڑا ادبی نوعیت کا تبصرہ لکھا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس خودنوشت سوانح عمری پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں اور ایک کتاب ''پذیرائی'' میں جمع کر دیئے گئے ہیں، لیکن شبیر حسین شاہ کی محبت کا انداز سب سے الگ ہے۔ پروفیسر جمیل آذر کی طرح انہوں نے بھی اس سوانح عمری پر پوری ایک کتاب رقم کر دی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے ''سفر جاری ہے'' اپنی لائبریری کے لئے خود حاصل کی تھی اور مطالعے کے بعد اس پر از خود تبصرہ لکھنے پر آمادہ ہو گئے اور اس کا اشاریہ بھی تیار کر دیا۔ میں نے ملاقات کی خواہش کی اور ننکانہ آنے کی اجازت چاہی تو وہ خود لاہور آ گئے۔ ان کی ملاقات میری زندگی کا حاصل ہے، ان کے مقدس چہرے کو دیکھ کر میرا ایمان تازہ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ (آمین)

پروفیسر موصوف آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج ننکانہ صاحب میں بطورِ اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات اپنی تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ان کا ''گوشۂ محققین'' بھی دن دگنی اور رات چوگنی خدمات انجام دے رہا ہے۔

Marfat.com

صائمہ نورین بخاری

صائمہ نورین بخاری کو ادب کی وراثت اپنے خاندان سے ملی ہے۔اس ادبی خاندان کا سب سے روشن نام خواجہ حسن نظامی کا ہے' جو اردو ادب کے صاحب اسلوب ادیب ہیں۔ان کا فیض صائمہ نورین بخاری تک غائبانہ طور پر پہنچا ہے۔تاہم ان کی تربیت میں ان کی والدہ شاہدہ فاروقی اور خالہ رعنا فاروقی کا زیادہ حصہ ہے' جو خود بھی ادیبہ تھیں اور جن کو اپنے خاندان کے فرد جلیل سید قاسم علی دہلوی سے براہ راست ادبی استفادے کا موقعہ ملا۔سید قاسم علی دہلوی شاعر اور نثر نگار تھے اور آزادی سے پہلے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک رہ چکے تھے۔ان کا خاندان تشکیلِ پاکستان کے بعد ملتان آ کر آباد ہو گیا تھا اور اب یہی ان کا وطن ہے۔

صائمہ نورین بخاری نے ادب کے ماحول میں آنکھ کھولی تو انہیں کہانیاں سننے اور کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔گیارہ برس کی عمر میں انہوں نے اردو کے مقبول ترین اخبار ''امروز'' میں پہلی کہانی ''جگنو'' بچوں کے صفحے پر لکھی۔اس دور میں امروز کا ادبی صفحہ اظہر جاوید مرتب کرتے تھے۔انہوں نے صائمہ نورین بخاری کے جوہر کو پہچان لیا اور پھر ان کی ادبی تربیت میں حصہ بھی لیا اور ان کے افسانے اپنے رسالہ ''تخلیق'' میں شائع کئے۔میں نے ان کا نام پہلی

Marfat.com

دفعہ رسالہ ''تخلیق'' کی ''انجمن خیال'' میں پڑھا اور ان کے خط سے اندازہ لگایا کہ وہ نہ صرف اچھی افسانہ نگار ہیں بلکہ ان میں تنقید کا جوہر بھی موجود ہے۔ تخلیق کے اسی پرچے میں ان کی ایک نظم بھی چھپی تھی جس کا موضوع عام نسوانی موضوعات سے الگ تھا اور اس میں شاعری کی گونج بھی سنائی دیتی تھی۔ میں نے اظہر جاوید صاحب سے ان کا پتہ لے کر اپنی خودنوشت ''سفر جاری ہے'' انہیں بھیج دی اور تبصرے کی خواہش بھی ظاہر کر دی۔ صائمہ نورین بخاری نے یہ کتاب لفظ لفظ پڑھ کر تبصرہ لکھا تو یہ اتنا خوبصورت تھا کہ میں نے فون پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ صائمہ نورین بخاری اب افسانے اور شاعری کے علاوہ تنقید بھی لکھ رہی ہیں۔ مقبول اکیڈمی کی کتابوں ''راہ نوردِ شوق''، ''غزل کے رنگ''، ''پرندہ سفر میں'' پر ان کے مقالوں کی تحسین تو ہندوستان کے ادیبوں نے بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی کتابوں پر روزنامہ ''نوائے وقت''، روزنامہ ''جنگ''، ''ماہِ نو''، اور ماہنامہ ''تخلیق'' میں ان کے تبصرے چھپ کر داد وصول کر چکے ہیں۔ ضمنی طور پر یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ صائمہ نورین بخاری اعلیٰ پائے کی مقررہ بھی ہیں۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے کئی تقریری مقابلوں میں ٹرافیاں حاصل کیں۔ مضمون نویسی کے مقابلوں میں انعامات اور گولڈ میڈل حاصل کیا، معاشیات اور انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا۔ گورنمنٹ ڈگری کالج برائے، خواتین خانیوال میں بطور آنریری لیکچرار خدمات سرانجام دی، لیکن اب زیادہ وقت ادب کو دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''منظر، خواب، دریچے'' اور شعری مجموعہ ''سفر آغاز کرتے ہیں'' منظرِ عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے خاندان کی اس شاعرہ، افسانہ نگار اور تنقید نگار سے اردو ادب کو بہت سی توقعات وابستہ ہیں اور میں ان کی کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں۔

Marfat.com

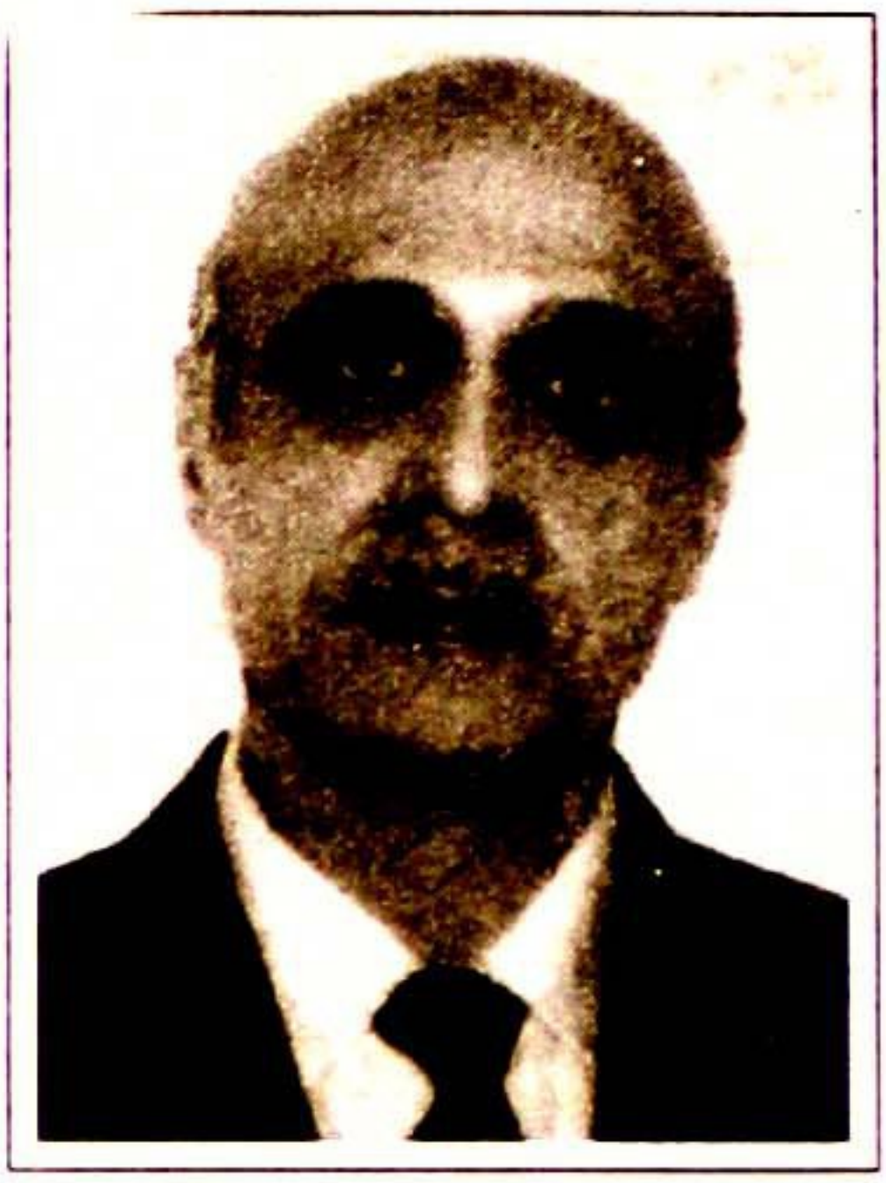

ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر صفدر محمود کو تاریخ پاکستان کا مؤرخ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن میں پاکستان کی تعمیر و تشکیل کو دیکھا تو مسلمانوں کی نظریاتی جدوجہد ان کی رگ و پے میں سما گئی۔ وہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۴ء کو ضلع گجرات کے ایک معروف گاؤں چیلیاں والا میں پیدا ہوئے تو تحریک پاکستان اپنے مقاصد کے حصول کیلئے قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ولولہ انگیز جدوجہد میں دیکھی تھی۔ انہوں نے ہوش سنبھالا اور شعور کی پہلی کرن بیدار ہوئی تو پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔ ان کے گاؤں سے ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے بھارت جا چکے تھے اور واہگہ پار سے مسلمان اس گاؤں میں آباد ہو چکے تھے۔ اب جو الاٹ منٹوں میں بدعنوانیوں کا دور شروع ہوا تو اس کا پورا مشاہدہ صفدر محمود کے معصوم ذہن نے کیا۔ گمان غالب ہے کہ انہوں نے اپنی تعلیم کے ابتدائی درجوں میں ہی پاکستان کے بارے میں تاریخ کی سچی حقیقت بیان کرنے کا عہد کر لیا تھا اور نصابی کتابوں کے علاوہ تاریخ اور ادب کی کتابوں کے مطالعے کو فوقیت دی۔

ڈاکٹر صفدر محمود نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز کیا۔ اس عرصے میں وہ اس

Marfat.com

نامور کالج میں اپنی دو حیثیتیں تسلیم کروا چکے تھے۔اول یہ کہ اس کالج کے بہترین کھلاڑی تھے۔اور دوم یہ کہ وہ ایک بہترین ادیب بھی تھے۔ان دونوں شعبوں میں انہیں ایوارڈ دیئے گئے اور کھیل کے میدان میں ان کے سپورٹس کی اور ادب کے میدان میں ان کے مضامین کی دھاک بیٹھ گئی۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ادب میں ان کا رجحان افسانے کے علاوہ مزاح کی طرف تھا۔ان کے افسانے محمد طفیل کے نامور رسالہ ''نقوش'' اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے ممتاز ادبی جریدہ ''نیا دور'' میں چھپتے تھے۔گورنمنٹ کالج سے نامور مزاح نگار احمد شاہ بخاری کی یاد میں جو اس کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے رسالہ ''پطرس'' جاری کیا۔صفدر محمود صاحب نے اس کالج سے فرسٹ ڈویژن میں ۱۹۶۴ء میں گریجوایشن کی اور پھر ایم اے کا امتحان ''سیاسیات'' کے مضمون میں پاس کیا اور فیلڈ مارشل ایوب خان سے جو اس وقت ملک کے صدر تھے ''رول آف آنر'' وصول کیا۔ایک دفعہ ملاقات میں ان کے اس اعزاز کا ذکر آیا تو صفدر محمود نے اس میں چنداں دلچسپی نہ لی۔بلکہ کہا کہ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس سال ایوب خان کو کالج کا نو دکیشن کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور کالج کے ضابطے کے تحت وہ ان سے ''سند اعزاز'' وصول کرنے کے پابند تھے۔بالفاظ دیگر وہ مارشل لاء کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کا مزاج طالب علمی کے زمانے میں ہی جمہوری تھا۔ان کی اس مزاج سازی میں گورنمنٹ کالج کے استاد مرزا محمد منور نے خصوصی کردار ادا کیا تھا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ کو اس فن کے تسلیم شدہ اصولوں کے مطابق لکھنے کی طرف بھی مرزا منور صاحب نے ہی متوجہ کیا تھا اس دور میں ہی ان کے تاریخی اور سیاسی مضامین امریکہ برطانیہ اور جرمنی کے ممتاز رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ان کے تراجم پاکستان کے اخبارات میں شائع ہوتے تو ملک بھر میں ایک خیال انگیز بحث چھڑ جاتی۔اور صفدر محمود کی مثبت جہت' پاکستان دوستی' اقبال اور قائداعظم سے عقیدت اور ان کی حب الوطنی سب کو متاثر کرتی۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اس قدر آزاد طبع صفدر محمود نے عملی سیاست میں آنے کی بجائے حکومت پاکستان کی اعلیٰ ملازمتوں میں شرکت کو ترجیح دی اور مقابلے کا امتحان پاس کر کے اپنی

Marfat.com

زندگی کا نیا دور شروع کیا جبکہ تھوڑے سے عرصے کے لئے انہوں نے محکمہ تعلیم میں درس و تدریس کا شعبہ بھی اختیار کیا تھا۔ ان کے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ صفدر محمود صاحب بیوروکریسی کی در پردہ منفی چالوں کا مشاہدہ کر چکے تھے اور یہ حقیقت جان چکے تھے کہ ملک کو دیانتدار، محنت کش اور سچے محبِ وطن سرکاری افسروں کی زیادہ ضرورت ہے جو اپنے کام سے عوام کی سچی خدمت کر سکیں اور حکومت کے مثبت احکامات کو سختی سے نافذ کر سکیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جس لگن سے صفدر محمود صاحب نے اعلیٰ عہدوں پر کام کیا اور خدمت پاکستان اور خدمت عوام کو پیشِ نظر رکھا ویسی لگن سیاستدانوں کے ''غلام افسروں'' میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔

صفدر محمود ذہنی طور پر اس مسلم لیگ سے تمام عمر وابستہ رہے جس نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان بنایا تھا اور وہ مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر نہ سیاستدانوں سے مرعوب ہوئے، نہ ان کے غیر آئینی احکامات کی تعمیل کی، نہ سفارش پر غور کیا، بلاشبہ انہیں بعض تنگ نظر سیاسی جماعتوں کے دور حکومت میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن انہوں نے ہر مشکل کا پامردی سے مقابلہ کیا اور بالآخر ۲۰۰۴ء میں سیکرٹری حکومت پاکستان کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ وہ پورے ملک میں عزت مند، خوددار اور فرض شناس افسر تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کا انفرادی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تحریک پاکستان کے گم شدہ خدمت گزاروں کو طلائی تمغے دینے کا سلسلہ شروع کیا جو مجید نظامی صاحب کی قیادت میں اب تک جاری ہے۔ ترانۂ پاکستان کے خالق حفیظ جالندھری کے جسد خاکی کو قبرستان کے گم نام گوشے سے نکال کر ان کے شایان شان مقام پر دوبارہ تدفین کا انتظام کیا اور ان کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

ڈاکٹر صفدر محمود کا ادبی ذوق کئی جہتوں میں پھیلا ہوا ہے، سرکاری ملازمت کے دوران وہ اپنے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تاثرات کو اپنے کالم ''صبح بخیر'' میں پیش کرتے تھے، جو روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ان کے قلمی نام سے چھپتا تھا۔ وہ مزاح کے نامور رسالہ ''اردو پنچ'' راولپنڈی کی مجلس ادارت میں شامل تھے اور اس میں خود بھی شوخ و شنگ مضامین لکھتے

Marfat.com

رہے۔ ''سدا بہار'' ان کے مزاحیہ مضامین کا اور ''آگہی'' ان کے تہذیبی مضامین کا مجموعہ ہے ان کی اعلیٰ اور وسیع الجہات خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا تھا' جس سے اس تمغے کی قدر و قیمت بڑھ گئی۔

میں لکھ چکا ہوں کہ ڈاکٹر صفدر محمود کی بنیادی حیثیت مؤرخ پاکستان کی ہے۔ انہوں نے مسلم لیگ کا دور حکومت ..... پاکستان کیوں ٹوٹا ..... آئین پاکستان ..... تاریخ و سیاست ..... سقوطِ مشرقی پاکستان ..... اور مطالعۂ پاکستان ..... کے مختلف عنوانات سے اردو میں کتابیں پیش کیں۔ ہندوستان کے ایک مصنف سیروانی کی کتاب کا ترجمہ ''تقسیم ہند ..... افسانہ اور حقیقت'' کے نام سے پیش کیا۔

اس کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد' کولمبیا یونیورسٹی، برکلے یونیورسٹی (امریکہ) اور لندن یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت میں خدمات انجام دینے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ انہیں اقوام متحدہ کے ادارے یونیسیکو میں ایگزیکٹو بورڈ کا رکن منتخب کیا گیا اور وہ ایجوکیشن کمیشن (یونیسیکو) کے وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اقراء یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر صفدر محمود کا جنون کبھی فروغ نہیں بیٹھا وہ روزنامہ ''جنگ'' میں روزانہ کالم لکھتے ہیں اور حال ہی میں بھارت کے ممتاز شاعر جگن ناتھ آزاد کی غلط بیانی کا پردہ چاک کیا ہے کہ قائداعظم نے انہیں آزادی سے پانچ روز پہلے پاکستان کا ترانہ لکھنے کے لئے کہا تھا جو ۱۴ اگست کو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے تحقیقی شواہد سے ثابت کیا کہ یہ جگن ناتھ آزاد کی دروغ بیانی ہے ان کا ترانہ کبھی پاکستان ریڈیو سے نشر نہیں ہوا۔

میرا ذاتی اعزاز یہ ہے کہ میں نے مقبول اکیڈمی سے ان کی ایک مقبول کتاب ''پاکستان کی اہم سیاسی جماعتیں'' شائع کی۔ لیکن میرا ان سے نیازمندانہ تعلق اس کتاب کی اشاعت سے پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صفدر محمود اسلامی ذہن کے انسان ہیں اور قرآنی

Marfat.com

تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ان کے مزاج میں نرمی ہے لیکن پاکستان، قائداعظم اور اقبال کے بارے میں کسی غلط بیانی کو قبول نہیں کرتے۔ان کی تاریخی کتابوں کے حوالے بیشتر غیر ملکی مصنفین بے دریغ استعمال کرتے اور ان کے نتائج سے اتفاق کرتے ہیں۔میں نے اپنی دیہاتی زندگی پر ایک سادہ سی کتاب لکھی تو ڈاکٹر صفدر محمود نے اس کا پیش لفظ لکھا اور میری حوصلہ افزائی کی۔کتابیں چھاپنے کے ساتھ ساتھ کتاب لکھنے کی نئی روایت کی تحسین کی اور لکھا کہ ''اسے جاری وساری رہنا چاہئے'' میں ان کے اس ارشاد پر عمل کی کوشش کر رہا ہوں اور فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس راہ پر ڈاکٹر صفدر محمود نے ڈالا ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر طارق عزیز

ادیبوں کی بھری مجلس میں ڈاکٹر طارق عزیز دور سے پہچانے جاتے ہیں سب سے پہلے ان کی مسکراہٹ دیکھنے والے کو اپنی طرف راغب کرتی ہے اور ان کو متبسم دیکھ کر غنچہ دل کھل اٹھتا ہے لیکن دوسرے لمحے جب احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنی کرسی سے اٹھ نہیں سکتے اور اس وہیل چیئر (Wheel Chair) کو لڑھکا کر آپ کا استقبال کرنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں تو ان کے ملاقاتی پر افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ میری ان سے اتنی ملاقاتیں ہو چکی ہیں کہ اب میں ان کی ''وہیل چیئر'' کو ان کی ٹانگیں تصور کرتا ہوں جس پر وہ پوری دنیا میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ میں آگے بڑھتا ہوں تو طارق عزیز اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں آگے بڑھ کر جھک جاتا ہوں اور بڑی محبت سے معانقہ کرتا ہوں۔ وہ میرے دوست ہی نہیں محسن بھی ہیں۔ مجھے جب بھی کسی مشکل میں ان کی مدد کی ضرورت پڑی ہے ہر ممکن حد تک انہوں نے محبت کا ثبوت دیا ہے۔

اب یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ طارق عزیز اوائل عمری میں پولیو کا شکار ہو گئے تھے۔ ان دنوں پولیو کے قطرے بچوں کو نہیں پلائے جاتے تھے اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ طارق عزیز اس وقت کی حکومت کی غفلت کا شکار ہو گئے لیکن انہوں نے اپنی اس بیماری کے ساتھ سمجھوتہ نہیں

Marfat.com

کیا بلکہ ''حرکت میں برکت'' کا سبق یاد کر لیا اور اپنی جسمانی معذوری کو اپنے کیریئر (Career) کی تعمیر میں رکاوٹ نہیں بننے دیا بلکہ اب تو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ قدرت نے ان سے اپنی ٹانگوں کا قدرتی تحرک چھین لیا تو ان کی بائیالوجی میں بے شمار دیگر خوبیاں بھر دیں ان کی فعالیت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے سکول' کالج اور یونیورسٹی میں عام صحت مند طلبا کے ساتھ شرکت کی لیکن ان کا ذہن اتنا تیز تھا کہ کلاس روم میں سنے ہوئے اساتذہ کے لیکچر انہیں یاد ہو جاتے اور پھر ہر امتحان میں انہیں نمایاں پوزیشن حاصل ہو جاتی۔ اس کا بہترین اور مصدقہ ثبوت یہ ہے کہ طارق عزیز ایم اے کرنے کے بعد فارغ نہیں بیٹھے بلکہ شعبۂ تعلیم میں ملازمت حاصل کر لی اور پھر تحقیق کی طرف آئے تو ایک ٹیکنیکل موضوع پر کام کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اسی مقالے کی تحقیق میں ان کے رہنما ڈاکٹر وحید قریشی صاحب تھے جو اپنے ذہین ترین طلبہ کی گنتی کرتے تو طارق عزیز کا نام فخر سے لیتے اور ان کی فوٹو گرافی میں مہارت کا ذکر کرنا بھی نہ بھولتے جو ڈاکٹر وحید قریشی کا اپنا مشغلہ بھی تھا۔

طارق عزیز ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ء کو جہلم میں ایک معروف علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے میٹرک سے لے کر ایم اے تک تمام مراحل نمایاں حیثیت میں طے کئے اور ''اردو رسم الخط اور ٹائپ'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس دوران انہوں نے زندگی کا مشاہدہ بھی کیا اور اپنی وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے لوگوں کا مطالعہ بھی کیا۔ ان کے تجربات کی کائنات وسیع اور متنوع ہے۔ ان تجربات کو دستاویزی حیثیت دینے کیلئے انہوں نے شاعری میں دسترس حاصل کی۔ نثر نگاری کی طرف آئے تو افسانے لکھے۔ تنقید میں قلم آزمائی' ٹیلی ویژن کو فروغ حاصل ہوا تو انہوں نے اس نئے میڈیم کیلئے متعدد ڈرامے لکھے۔ دستاویزی فلموں کی ڈائریکشن کی اور اب تک کئی ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن وہ تعلیم کے پیشے پر زیادہ اطمینان کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ دوسرے تمام پیشے انسانوں کے ذاتی مفادات اور مالی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں لیکن تعلیم کے شعبے میں استاد اپنی ذات کو تقسیم کرتا

Marfat.com

ہے' اور اپنے علم کا تمام فیض طلبہ کو منتقل کرنے کے بعد انہیں وطن عزیز کا کامیاب شہری بنا دیتا ہے اور وہ فخر سے کہتے ہیں کہ میری متبادل حیثیت ایک معلم اور ادیب کی ہے۔ ویسے تو ہر مسلمان کے سامنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے' اور ان کے اسوۂ حسنہ کو اپنی پوری زندگی پر نافذ کرنا کامیابیوں کی دلیل ہے' تاہم ڈاکٹر طارق عزیز کا طریق عام لوگوں سے مختلف ہے۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی مشعل راہ ہے۔ انہیں زندگی میں جب بھی کوئی مشکل پیش آتی ہے' تو وہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کھول کر پڑھنے لگتے ہیں اور ان کی مشکل خود بخود حل ہو جاتی ہے۔ ایک اخبار کو انٹرویو دیا تو یہ کہنے میں بے پایاں مسرت محسوس کی وہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے حکمران' تاجدار اور آمر سے متاثر نہیں ہوئے اور ان کے لئے اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی زندگی کا حقیقی رہنما ہے۔ وہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ شافع محشر ہیں۔ عقیدت کا یہ زاویہ ڈاکٹر طارق عزیز کی شاعری میں نعت نگاری کی صورت میں ابھرا ہے۔ مندرجہ ذیل نعت میں ان کا لہجہ ملاحظہ کیجئے۔

میری آنکھوں میں بھیگی ہوئی ہے دعا .....یا حبیب خداؐ
میرے ہونٹوں پہ ٹھہری ہوئی ہے صدا .....یا حبیب خداؐ

.....

میں کہاں تک سنبھالوں گا زیتون کو.....بے اماں خون کو
میری شاخوں پہ مرنے لگی فاختہ.....اے حبیب خداؐ

.....

منجمد ہو گیا ہے نظامِ عمل .....کیجئے کوئی حل
بے اثر ہو گئی میری آہِ رسا ..... اے حبیب خداؐ

ڈاکٹر طارق عزیز نے متنوع موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''جلاوطن'' کے نام سے چھپا اور اہل ادب نے شاعری میں طارق عزیز کی جدت طرازی کو تازہ ہوا

Marfat.com

کا جھونکا قرار دیا۔ ''اردو رسم الخط اور ٹائپ'' ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس کی اساس پر اب کمپیوٹر کتابت کو فروغ مل رہا ہے' ''سکڑتا ہوا آدمی'' اور ''بسیرا'' ان کے ڈراموں کے مجموعے ہیں۔ ''نئی ادبی جہتیں'' میں ان کے تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتابیں میں نے اپنے ادارے مقبول اکیڈمی سے شائع کی ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کے خطبات کو عام فہم زبان میں پیش کیا اور ان خطبات کے اہم مطالب اپنی تلخیص میں سمیٹ لئے۔ چنانچہ وہ طلباء جو سید نذیر نیازی کے ترجمے کو سمجھ نہیں سکتے وہ ڈاکٹر طارق عزیز کی ''تلخیص خطباتِ اقبال'' سے ہی استفادہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر طارق عزیز نرم دل' نرم خو' نرم مزاج اور حقیقی معنوں میں شریف النفس انسان ہیں۔ انہوں نے دوست نوازی کی صفات اپنے والد محترم سے ورثے میں پائیں اور ان کی تربیت کا فریضہ ان کی والدہ نے ادا کیا۔ میں جب کبھی انہیں ملنے کے لئے گیا وہ ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملے اور پہلے سوال میں میری' میرے اہل وعیال کی اور میرے ادارے مقبول اکیڈمی کی خیریت دریافت کرتے اور اس کی ترقی کا حال پوچھتے ہیں۔ میں جب اپنی نئی کتابیں پیش کرتا ہوں تو ان کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ کتاب ان کی پہلی اور آخری محبت ہے۔ مجھے اس بات پر بھی فخر ہے کہ میری کتاب ''سفر جاری ہے'' کا نام انہوں نے ہی تجویز کیا تھا اور دلیل یہ دی تھی کہ اس نام میں زندگی بھی ہے اور تحرک بھی اور مقبول اکیڈمی کا سفر ابھی جاری ہے۔

Marfat.com

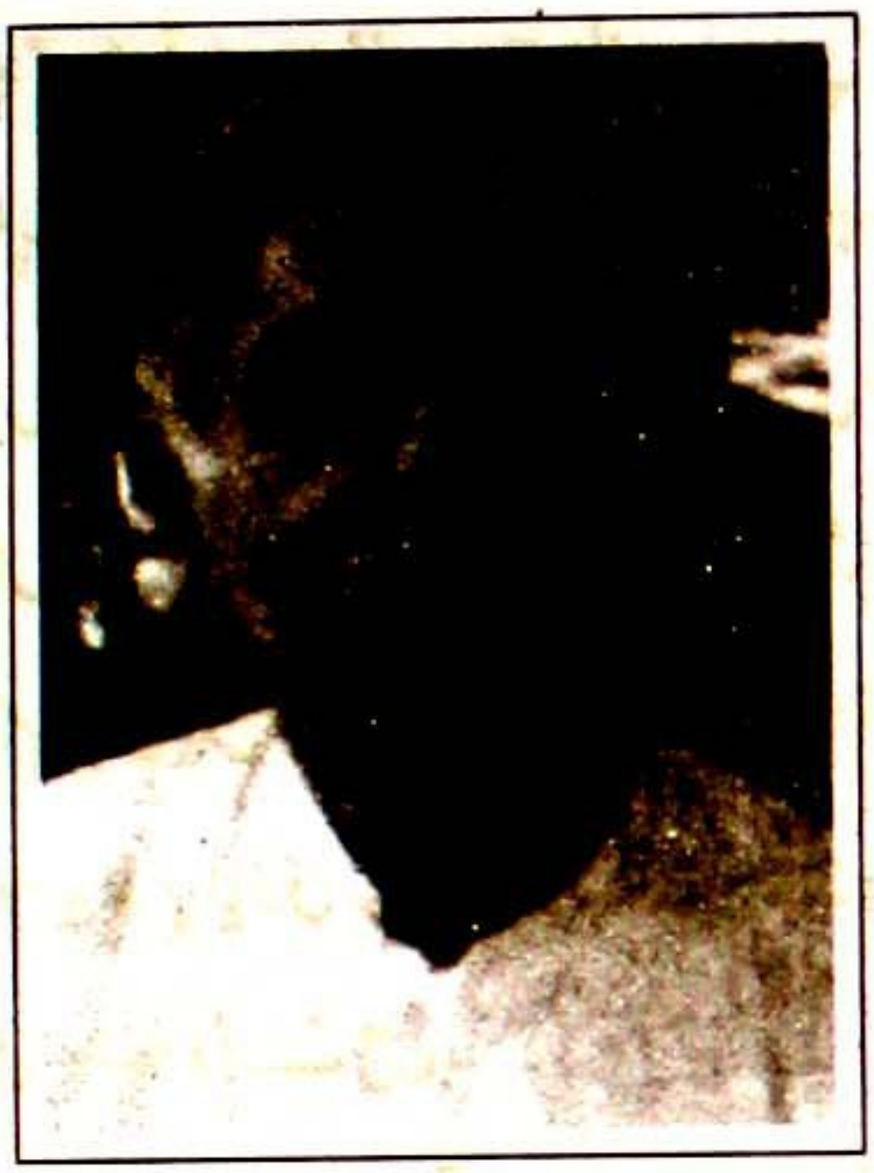

عباس خان

جناب عباس خان کی عملی زندگی عدل وانصاف کے محکمے میں گزری ہے۔ان کا شمار پاکستان کے ان ججوں میں ہوتا ہے جو خود خاموش رہتے ہیں لیکن جن کے فیصلے بولتے ہیں اور جو کچھ مدعی اور مدعا علیہ پڑھتے ہیں اس میں صرف سچ نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان سے کبھی کوئی فریق ناراض نہیں ہوا۔دوسری طرف ان کے فیصلوں پر ہائی کورٹ کے انتظامی شعبے کی نظر پڑی تو ان کی ترقی کی راہیں خود بخود ہموار ہوتی چلی گئیں۔وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے سول جج کے عہدے پر متعین ہوئے تھے۔ریٹائر ہوئے تو عدالت ہائے احتساب کے عہدے تک پہنچ چکے تھے۔

جناب عباس خان کی شخصیت کا دوسرا نقش ان کے ادب میں ظاہر ہوتا ہے۔اور یہاں بھی وہ ایسے ادیب نظر آتے ہیں جن کا تعارف ان کی کتابیں کراتی ہیں اور ان کا شمار اردو ادب کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جو اہل تصوف کی طرح خود اپنے نام سے بھی پردہ کرتے ہیں' آپ سے ملاقات ہو تو آنکھیں نیچی کر کے یوں بات کریں گے جیسے کہ آپ ان کے افسر اعلیٰ ہوں یا آپ مغل شہنشاہ اکبر اعظم یا جہانگیر یا شاہجہان ہوں اور یہ آپ کے دربار میں کسی سوال کے بغیر صرف

Marfat.com

آپ کی زیارت کے لئے آ گئے ہوں۔اردو ناول اور افسانے پڑھنے والے اس حقیقت سے بالکل واقف نہیں ہوں گے کہ وہ جس ادیب کے ناولوں میں معاشرے کا عکس دیکھتے ہیں اور جس تخلیق کار کے افسانوں میں کرداروں کی معاشرتی بدعنوانیاں دیکھ کر کڑھتے ہیں وہ ہائی کورٹ لاہور سے جج کے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور اب کل وقتی ادیب کی خدمات انجام دے رہے ہیں تو نمود و نمائش سے بے نیاز رہنے کی کوشش کو اپنا اسلوب حیات بنا رکھا ہے۔

جناب عباس خان ۱۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کو ضلع بھکر کی بستی گجہ میں پیدا ہوئے۔ پنجاب کے مختلف مقامات پر عدالتی فرائض انجام دینے کے بعد مستقل طور پر ملتان میں قیام پذیر ہیں۔انہوں نے ایم اے ایل ایل بی کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی کے لاء کالج سے مکمل کی اور پھر اپنے میرٹ' اعلیٰ صلاحیتوں اور منصفانہ فیصلوں کی اساس پر ترقی کرتے چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ ان کا نام ہی ان کی ترقی کی ضمانت بن جاتا تھا۔اس محکمہ میں ان کی دیانت اور امانت ضرب المثل کی طرح مشہور تھی۔کہا جاتا ہے کہ وہ گھر سے سائیکل پر آتے۔سائیکل اسٹینڈ پر یہ دو پہیہ گاڑی کھڑی کرتے تو سائیکل اسٹینڈ کے ٹھیکیدار سے ٹوکن لے کر کمرۂ عدالت میں کرسی عدالت پر بیٹھ جاتے۔ پہلے وہ عام شہری نظر آتے تھے اب جج نظر آنے لگتے۔جن لوگوں نے ان کو کام کرتے دیکھا ہے وہ بتاتے ہیں کہ روز کا کام روز کر کے اٹھتے اور کبھی کوئی فیصلہ التواء میں نہ ڈالتے۔عدالت کا کمرہ ان کی تجربہ گاہ تھی جہاں سے وہ حقیقی زندگی کے واقعات سمیٹتے اور پھر ان کو تخلیق کار سے افسانہ یا ناول کی صورت دے ڈالتے۔افسانے میں جیسی سنگین حقیقت نگاری جناب عباس خان نے کی ہے ویسی حقیقت نگاری بہت کم ادیبوں نے کی ہے۔

جناب عباس خان فرماتے ہیں افسانہ اور ناول لکھتے ہوئے میں کسی اور دنیا میں چلا جاتا ہوں۔انہوں نے اس کی مثال اپنے ایک ناول ''میں اور امراؤ جان ادا'' سے دی۔جس میں

Marfat.com

انہوں نے مرزا ہادی رسوا کے لکھنو سے اپنا الگ لکھنو آباد کیا ہے۔اس لکھنو کی امراؤ جان ادا بھی رسوا کے ناول سے مختلف ہے۔جناب عباس خان کی ایک اور کتاب کا عنوان ''دھرتی بنام آکاش'' ہے۔اسے دھرتی کے باسیوں کا مقدمہ سمجھئے جو انہوں نے خالق کائنات کے خلاف پیش کیا ہے۔(میرا خیال ہے کہ یہ کتاب لکھتے وقت ان کے سامنے علامہ اقبال کی مشہور نظم ''شکوہ'' ہوگی) لیکن اس کتاب میں شکایت کا انداز الگ ہے۔''قلم کرسی اور وردی'' میں انہوں نے سول اور فوجی بیوروکریسی میں قلم کی حرمت کو موضوع بنایا ہے۔ان کی چند اہم کتابوں کے عنوانات ملاحظہ فرمائیے۔

جسم کا جوہڑ، اس عدالت میں، زخم گواہ ہیں، تنسیخ انسان ''تو اور تو''

ناول ان کی طویل بیانی کا اور افسانہ ان کی مختصر نویسی کا تخلیقی اظہار ہے۔جناب عباس خان کے فن کی ایک شاخ ان کی کالم نگاری ہے۔ایک لمبے عرصے تک وہ روزنامہ ''نوائے وقت'' ''ملتان میں ہفتہ وار کالم لکھتے رہے ہیں۔ان کالموں کا مجموعہ ''دن میں چراغ'' کے نام سے شائع ہوا۔

جناب عباس خان کو فطرت نے نفس مطمعنہ عطا کیا ہے۔وہ دنیا کو حریص حکمرانوں اور آمروں کی طرح نہیں دیکھتے بلکہ مساوات انسانی میں یقین کامل رکھتے ہیں اور دولت کو ہاتھ کا میل سمجھ کر اس سے دور بھاگتے ہیں۔ان کے آباؤ اجداد کا پیشہ کاشتکاری تھا۔ضلع بھکر میں ان کی اراضی ایک زمانے میں ریت کے ٹیلوں کی صورت نظر آتی تھی۔لیکن تھل کینال کے پانی نے ریت کے ان ٹیلوں کو زرخیز بنا دیا۔جناب عباس خان نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا آبائی پیشہ کاشتکاری سنبھال لیا ہے۔اور اس غیر مطمئن دور میں بڑی طمانیت کی زندگی گزار رہے ہیں۔میرے لئے فخر

Marfat.com

کا مقام ہے کہ وہ مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہیں لیکن میں انہیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں جن کا سایہ مقدس ہے۔ بلاشبہ عباس خان جیسے بے لوث' بے ریا' دیانتدار' مخلص اور محبِ وطن لوگوں نے پاکستان کی کشتی کے چھید بند کر رکھے ہیں اور کشتی طوفانوں کا سامنا کامیابی سے کر رہی ہے۔ وہ انسان کے لبادے میں ولی ہیں۔ اس ولی کے ''ملفوظات'' ان کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور یہ کتابیں ہمیں فلاح کی راہ دکھاتی ہیں۔

Marfat.com

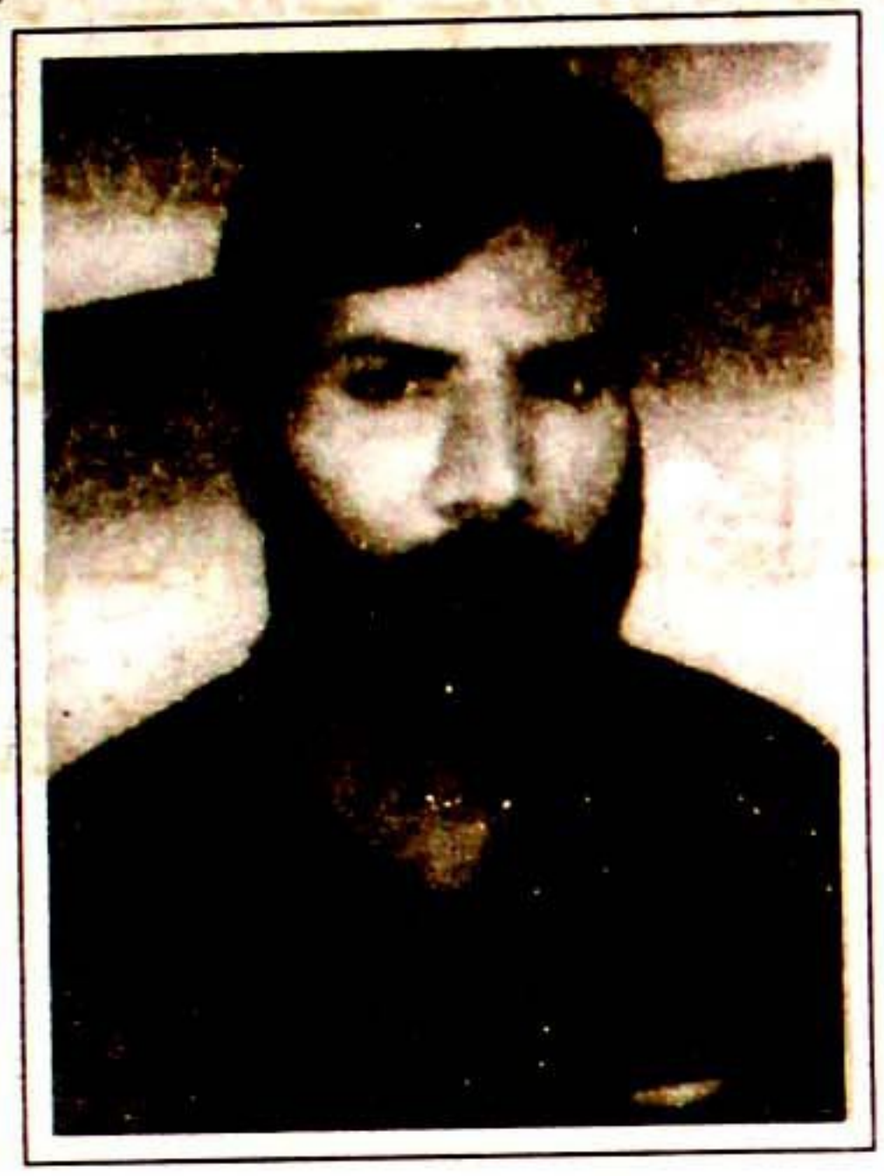

علامہ عبدالستار عاصم

علامہ عبدالستار عاصم کو میں اپنے ایسے دوستوں میں شمار کرتا ہوں جن پر آپ آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں۔ صحافت ان کا اوڑھنا بچھونا ہے' اور ان کا قلم گلہائے شگفتہ بکھیرنے میں شہرت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم کی دولت سے سرفراز کیا ہے' جس میں اضافہ کرنے کیلئے وہ پاکستان میں چھپنے والی ہر نئی کتاب کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں' ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ پاکستان کے تمام اہم اخبارات میں اس کی خبر بھی چھپوا دیتے ہیں۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ وہ صبح کا ناشتہ اخبارات سے کرتے ہیں۔

جناب عبدالستار عاصم کی تاریخ پیدائش پاکستان کے تاریخ پیدائش سے ہم آہنگ یعنی وہ ۱۴ اگست کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت پاکستان ۲۳ برس کا ہو چکا تھا' یعنی یہ ۱۹۷۰ء کا سال تھا۔ اس وقت ملک میں عام انتخابات کی تیاری ہو رہی تھی اور گلی کوچوں میں مختلف سیاسی پارٹیوں کے نعرے گونج رہے تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالا تو ملک مارشل لاء کے شکنجے سے نکل چکا تھا لیکن فضا میں سیاست کی برقی رو دوڑ رہی تھی۔ عبدالستار عاصم نے اس رو کے جھٹکے ایم اے تک کی تعلیم کے دوران کالج کی فضا میں محسوس کئے اور پھر اس کرب سے بھی گزرے جو مارشل لاء کی

Marfat.com

وجہ سے پورے ملک پر عذاب خداوندی بن کر نازل ہو گیا تھا۔ عاصم صاحب نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے قلم کو تحفظ پاکستان کے لئے استعمال کریں گے اور سرکاری نوکری نہیں کریں گے۔ اس خیال کے تحت ہی انہوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور کالم نگاری کے علاوہ فیچر نگاری بھی کرنے لگے۔ ان کے قلم میں بڑی قوت تھی۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ ان کی رائے منفرد تھی۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے بے تکان لکھتے چلے جاتے۔ ان کے مضامین ملک کے بے شمار ادبی' سیاسی' سماجی اور تہذیبی رسائل میں چھپتے اور انہیں ہندوستان کے اردو اخبارات و رسائل بھی نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے کیونکہ وہ مسلم امہ کو متحد کرنے میں یقین رکھتے تھے اور ان کا مخاطب ہر خطے کا مسلمان ہوتا تھا۔ ان کے مضامین کا معیار اتنا بلند تھا کہ انہیں ''علامہ'' تسلیم کرلیا گیا۔

اس دوران انہوں نے القلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی۔ اب ان کے مخاطبین پوری دنیا کے مسلمان تھے۔ اس فاؤنڈیشن نے کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا اور اس کا مقصد مشاہیر اسلام کے بارے میں نوجوان نسل کو باخبر کرنا تھا۔ ایک دفعہ شرق پور تشریف لے گئے تو انہیں صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقعہ ملا۔ اس پہلی ملاقات ہی نے عبدالستار عاصم کی زندگی کا رخ تبدیل کر دیا۔ پہلے وہ دنیا دار انسانوں میں اعلیٰ اخلاقیات کی تبلیغ میں مصروف تھے کہ دنیا خیر و شر سے محفوظ ہو جائے اور دنیاوی امور میں دیانت و امانت کو فروغ ملے۔ اب ان کی سوچ نے نیا رخ اختیار کیا۔ اور وہ روح کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے تصوف کی راہِ مستقیم پر چلنے لگے۔ ان کے نزدیک دنیا دار انسان اگر تصوف کی طرف آ جائے تو نہ صرف اس کی زندگی سنور جاتی ہے' بلکہ اس کے دل میں عاقبت کو سنوارنے کا خیال بھی پیدا ہو جاتا ہے اور وہ عمل خیر کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ عبدالستار عاصم اپنے مرشد سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے اپنے قلم کو ان کے حالات حیات لکھنے پر مامور کر دیا۔ ان کی یہ کتاب ''انوار جمیل'' کے

Marfat.com

نام سے چھپ چکی ہے۔ پھر انہوں نے مولانا عبدالکریم ابدالوی کا تذکرہ تالیف کیا۔ ''ذرہ سے آفتاب'' کے عنوان سے انہوں نے لاہور کے مشہور صنعت کار میاں محمد شریف پر ایک کتاب ان کی وفات کے بعد مرتب کی تو میں نے ان کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ عبدالستار عاصم نے مجھے بتایا کہ یہ کتاب انہوں نے خود مرتب نہیں کی بلکہ انہیں اس کا حکم اوپر سے ہوا تھا۔ ان کی نظر میں میاں محمد شریف کو اللہ نے ذرے سے آفتاب بنایا تھا تو وہ اپنی دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھے بلکہ اسے خلق خدا کی خدمت کے لئے صرف کیا۔ اور کئی ایسے ادارے بنا دیئے جو غریبوں کے لئے فلاحی خدمات انجام دیتے تھے..... اس کتاب نے علامہ صاحب کے سامنے تصنیف و تالیف کا ایک نیا میدان کھول دیا تاہم انہوں نے ایسی کتابوں کی ترتیب و تدوین کو اہمیت دی جن کے مطالعے سے خلق خدا کے سامنے مشاہیر کے کارنامے آ سکیں اور ترقی کا راستہ کھولا جا سکے۔ اب ان موضوعات کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ ''تاریخ پٹیالہ'' ..... ''تاریخ پنجاب''..... ''کلیات گیلانی'' اور ''صحافت شہر لاہور'' کے بعد انہوں نے مولانا سرفراز نعیمی شہید پر ایک جامع کتاب شائع کی ہے۔

علامہ عبدالستار عاصم میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بہت سے لوگوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے' میرا خیال ہے کہ عبدالستار عاصم کے پاس ضرور کوئی گیدڑ سنگھی ہے کہ کئی دہلے مشٹنڈے، آوارہ گرد، اٹھائی گیرے' فلمی اداکار' صحافی' ادیب' صنعت کار' سیاستدان، علماء، وکیل' شاعر وغیرہ ان کے گرویدہ ہیں۔ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت لاہور میں وہ واحد ادیب صحافی ہیں جن کا کوئی دشمن نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دشمن سے بھی ملیں تو اس کو پہلے مٹھائی کا ڈبہ پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن نہ جانے مجھے کیوں یہ خیال آتا ہے کہ وہ مقبول اکیڈمی سے میری نسبت بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ میں وجہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ تو وہ بولے۔

Marfat.com

''مقبول احمد سے ملاقات ایک فرد سے ملاقات ہے۔ لیکن
مقبول اکیڈمی مجھے مشاہیر و مصنفین عالم سے ملاقات کرا دیتی ہے۔
اور پھر وضاحت کی۔

''مقبول اکیڈمی مجھے آپ ہی کی طرح عزیز ہے''۔

ان کے ایک چھوٹے سے گلشن میں ایک خوبصورت ''کنول'' اپنی پوری
آب و تاب سے بہار آفریں ہے۔ اللہ کریم اس گلشن کو سدا آباد رکھے اور
اس میں طرح طرح کے حسین و جمیل پھول کھلیں۔ (آمین)

Marfat.com

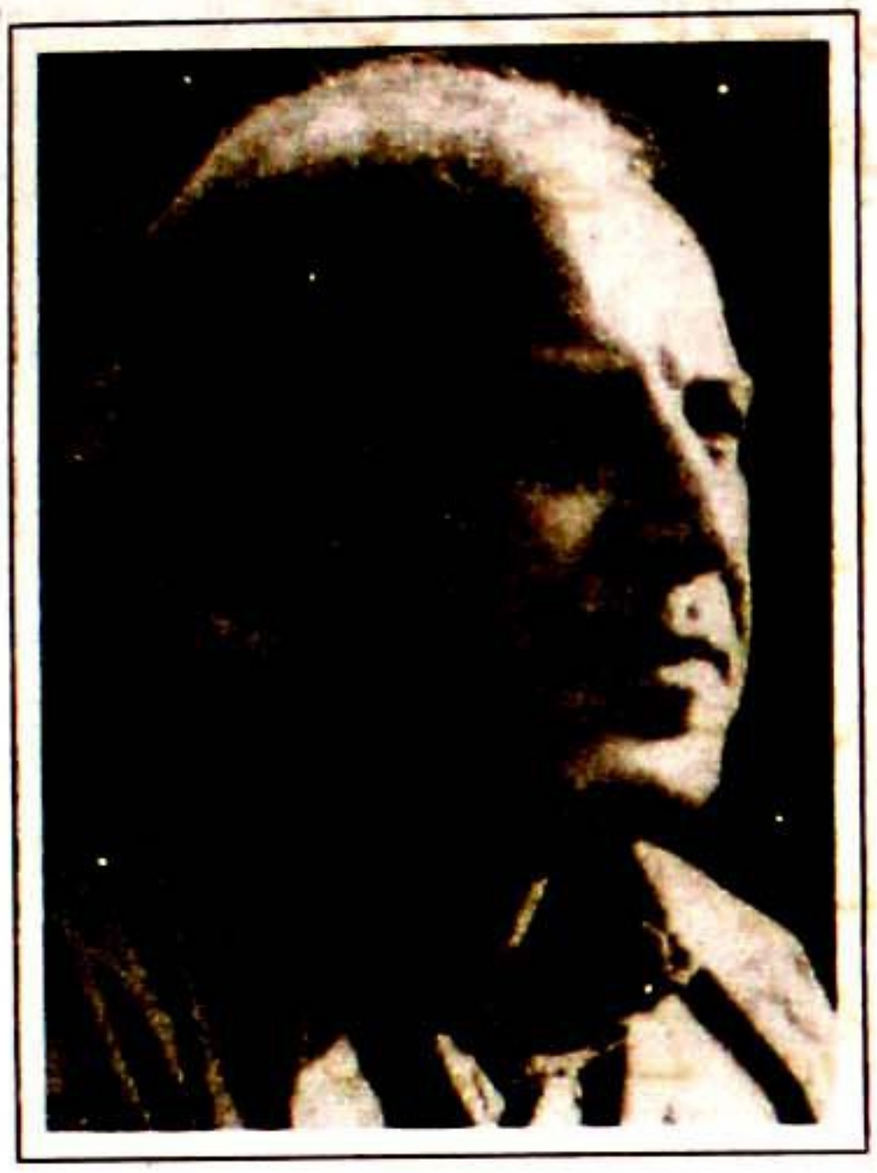

عبدالعزیز خالد

شاعر اعظم عبدالعزیز خالد یاد آتے ہیں تو دل سے اک آہ نکلتی ہے کہ وہ اچانک اس دنیا سے کیوں رخصت ہو گئے اور اللہ نے مجھے ایک مہربان دوست اور مشفق رہنما سے کیوں محروم کر دیا جس کی فطرت کریمانہ تھی اور جس کا مزاج خسروانہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کی ۸۰ ویں دہائی عبور کر چکے تھے اور ۱۵ جنوری ۲۰۱۰ء کو ۸۳ ویں سال میں قدم رکھ چکے تھے لیکن تخلیق فن کے لحاظ سے وہ ابھی جوان بلکہ نوجوان تھے۔ ہر ماہ ان کی ایک نعت یا حمد اور ایک نظم یا رباعیات لاہور کے ادبی رسالہ الحمراء میں چھپتی' ان کی غزل تخلیق اور ادب لطیف میں شائع ہوتی تو مقبول اکیڈمی میں جمع ہونے والے ادبائے کرام انہیں بڑی محبت سے پڑھتے لیکن کسی میں ہمت نہ ہوتی کہ ان کی داد موزوں الفاظ میں پیش کر سکے۔ وجہ یہ کہ عبدالعزیز خالد کا مطالعہ ان سب ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ تھا اور خالد صاحب کی شاعری میں ان کا مطالعہ اس طرح شامل ہوتا تھا جیسے یہ کتابیں صفحہ بہ صفحہ کھول کر اقتباسات آپ کو سنا رہے ہوں۔ میں جب ان ادیبوں کے چہروں پر کم علمی کی بے بسی لکھی ہوئی دیکھتا تو اپنے آپ پر فخر کرتا کہ میں نہ شاعر تھا اور نہ ادیب بلکہ عبدالعزیز خالد کا ایک ادنیٰ نیاز مند اور ان کے فن کا مداح تھا۔

Marfat.com

میرے لئے فخر کی کوئی بات تھی تو صرف یہ کہ میں نے ان کی نعت کی کتابیں ''ماذ ماذ'........عبدہٗ'........حمطایٰ اور طاب طاب' چھاپیں تو عبدالعزیز خالد نے ان کی طباعت اور پیشکش کی تعریف کی تھی۔شعلۂ چنار' دشت شام' زرداغ دل، حدیث خواب، سراب ساحل اور سخن ہائے آشنا' بھی مقبول اکیڈمی سے ہی چھپ کر اہل ادب تک پہنچیں تھیں لیکن ''مہا بھارت کتھن مالا'' چھپی اور میں نے ان کی خدمت میں پیش کی تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔کرسی سے اٹھے' میز کی دوسری طرف آئے اور مجھے گلے سے لگالیا۔میں اس معانقے کی گرمی آج تک نہیں بھولا اور پھر ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء کو دکھ کا وہ لمحہ بھی آیا جب عبدالعزیز خالد نے اپنا تخلیقی سفر ختم کر دیا اور اپنی جان خالق حقیقی کے سپرد کر دی اور مجھے اس غم میں مبتلا کر گئے کہ اب میں ان کی کوئی نئی کتاب شائع نہیں کر سکوں گا۔دوسرے لوگوں کے مقابلے میں میرا غم دوسری نوعیت کا تھا اور گہرا تھا۔

عبدالعزیز خالد ۱۵ جنوری ۱۹۲۷ء کو ''رجھانِ کلاں'' تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ان کے والد محترم جناب شاہ محمد ایک ٹاٹ سکول میں مدرس تھے۔بیٹے کے ادبی اور علمی رجحان کو انہوں نے ہی پروان چڑھایا اور عربی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔وہ پرائمری کے درجے میں ہی قرآن کریم ناظرہ مکمل کر چکے تھے اور پھر میٹرک پاس کرنے تک وہ نہ صرف خود شعر کہنے لگے بلکہ انہوں نے قرآن کریم بامعنی حفظ کر لیا تھا اور آیات ان کی نظموں میں بامعنی انداز شامل ہونے لگی تھیں۔میرا خیال ہے کہ اردو شاعری میں یہ امتیاز بہت کم شاعروں کو حاصل ہوا ہے کہ قرآنی آیات کو باموقع اور برمحل اسی طرح استعمال کریں کہ ان کی شاعری ان آیات کی برکت سے جگمگا اٹھے۔

عبدالعزیز خالد کے بارے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے میٹرک تک پہنچنے کے دوران زمانہ جہالت کے عرب شعرا کا بہت سا کلام پڑھ لیا تھا اور ان کے اثرات نے ان کی شاعری کو بھی متاثر کیا تھا۔تیسری بات یہ کہ عبدالعزیز خالد متحدہ پنجاب میں میٹرک کے امتحان میں

Marfat.com

پنجاب یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔وہ مزید تعلیم کے لئے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور کالج کے رسالہ ''کریسنٹ'' کے ایڈیٹر بنائے گئے اس دور میں وہ طالب علم تھے لیکن پروفیسر رفیق خاوران کی علمی فضیلت کا اعتراف کرتے تھے اوران کے ساتھ اقبال ہوسٹل میں بیٹھ کر مختلف ادبی موضوعات پر بحث ومباحثہ کرتے تھے۔اس دور میں ناصر کاظمی بھی ان کے ساتھ ہوسٹل میں رہتے تھے لیکن ناصر کاظمی ان کے سینئر تھے اور وہ مشاعرے میں کامیاب شاعر قرار دیئے جا چکے تھے۔عبدالعزیز خالد کی زبان میں تھوڑی سی لکنت تھی۔اسی لئے وہ مشاعرے پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔ویسے بھی وہ مجالس میں زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن روبرو ملاقات میں اتنی تیزی اور روانی سے بولتے کہ ان کی لکنت کا پتہ بھی نہ چلتا اور محسوس ہوتا کہ علم کا دریا بہتا چلا جا رہا ہے۔اور سننے والے اس سے مقدور بھر استفادہ کر رہے ہیں۔

عبدالعزیز خالد کے بارے میں یہ لطیفہ بھی مشہور ہے کہ انہوں نے اپنا کلام اردو کے مشہور رسالہ ''ہمایوں'' کو اشاعت کے لئے بھیجا تو ہمایوں کے مدیر یوسف ظفر نے کہا کہ ہمایوں عربی کا رسالہ نہیں۔اپنا اردو کلام بھیجئے۔معروف مزاح نگار ضمیر جعفری کہا کرتے تھے کہ عبدالعزیز خالد کو اپنی عربی شاعری کا ترجمہ بھی خود کر دینا چاہئے۔اسلامیہ کالج کی تعلیم کے دوران انہوں نے عمرانیات کے سب مضامین میں اول آنے کا اعزاز حاصل کیا۔ایک سال قائداعظم محمد علی جناح اس کالج میں تقسیم انعامات کے لئے تشریف لائے تھے۔عبدالعزیز خالد کا نام متعدد مضامین میں اول آنے پر بار بار پکارا جانے لگا تو قائداعظم محمد علی جناح یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

''ذہین نوجوان! کچھ انعامات دوسرے لڑکوں کے لئے بھی چھوڑ دو' سارے انعام خود نہ لے جاؤ''۔

اس جملے نے پورے ہال میں گونج پیدا کر دی۔کالج کے پرنسپل عمر حیات ملک نے اس جملے پر تالیاں بجا کر داد دی اور پھر جیسے ہال تالیوں سے گونجا اٹھا۔

عبدالعزیز خالد نے ایم اے اقتصادیات میں کیا تھا۔اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمہ انکم ٹیکس

Marfat.com

کے گزٹیڈ افسر کی حیثیت سے کیا اور کمشنر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو مستقل طور پر لاہور میں ہی آباد ہو گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ انکم ٹیکس افسر عبدالعزیز خالد اور شاعر عبدالعزیز خالد دو مختلف شخص تھے اور ان دونوں کے لئے ان کے دفتر میں الگ الگ کرسیاں رکھی گئی تھیں۔ یہ سنی سنائی بات ہے کہ دفتر میں ان پر شاعری کی کیفیت طاری ہوتی تو اپنی منصبی کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر بیٹھ جاتے اور مقدمے کی سماعت تھوڑی سی دیر کے لئے روک دیتے تھے۔ میں ان کے دفتر میں کئی مرتبہ حاضر ہوا ہوں لیکن انہیں دفتر میں شعر کہتے نہیں دیکھا۔ ہاں گھر میں وہ دفتر کا کام نہیں کرتے تھے اور کتابوں میں گھرے رہتے۔ مہمان آتا تو کتاب ایک طرف رکھ دیتے، دروازے پر استقبال کرتے اور باتیں کرنے لگتے۔ مہمان کے چھوٹے سے سوال کے جواب میں طویل جواب دیتے ان کی اس خوبی کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ دوسرے شاعروں کی طرح مہمان کو اپنی شاعری نہیں سناتے تھے لیکن اپنے مطالعے کے ثمرات بے دریغ تقسیم کرتے تھے۔ میں نے ان سے زیادہ مضبوط حافظے والا انسان نہیں دیکھا۔

عبدالعزیز خالد کی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مقبول اکیڈمی سے چھپنے والی کتابوں کے نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ چند مزید کتابوں کے نام اپنی یادداشت سے لکھ رہا ہوں۔ ماتم یک شہر' کف دریا' برگ خزاں' دکان شیشہ گر' ورق ناخواندہ' سلامی' زنجیر رم آہو' غزل الغزلات' سرود رفتہ، غبار شبنم' پرواز عقاب ..... نعت کی کتابوں میں فار قلیط' منحمنا کے علاوہ چند دیگر کتابیں دوسرے اداروں سے شائع ہوئیں۔ عبدالعزیز خالد شاید اردو کے واحد شاعر ہیں جن پر رسالہ ''تحریریں'' اور رسالہ ''سیارہ'' نے تین جلدوں میں نمبر شائع کئے۔ جناب ڈاکٹر حسین سحر اور کامل القادری نے ان کے فن پر ان کی زندگی میں کتابیں لکھیں۔ ان کی آخری نظم رسالہ الحمراء میں چھپی جس میں انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا۔

Marfat.com

بس کہ قدرت نے کیا تھا تجھ کو پیدا ہی فقط تخلیق کاری کیلئے
دل فگاری کے لئے اختر شماری کے لئے
اشک ہائے لالہ گوں سے کشت زار فکر و فن کی آبیاری کے لئے
حرف ہائے تازہ و افکار نو کی نخل کاری کے لئے

افسوس! یہ قادرالکلام شاعر ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

Marfat.com

عذرا اصغر

آزادی کے بعد اُردو افسانے اور ناول کو جن خواتین نے گیسوئے تابدار کی طرح آبدار کیا ان میں ایک اہم نام عذرا اصغر کا بھی ہے۔ عذرا اصغر زندگی کو باریک بینی اور تنقیدی صلاحیت سے دیکھنے والی ناظرہ ہیں۔ وہ اپنی کہانیاں معاشرے کی لخت لخت حالت سے حاصل کرتی ہیں اور ان ٹکڑوں کو اس فنکاری سے جوڑتی ہیں کہ آپ کے سامنے واقعہ زندگی کا نمائندہ بن کر آ جاتا ہے۔ اور بعض اوقات تو واقعے اور کردار آپس میں اس قدر پیوست ہوتے ہیں کہ زندگی اپنی صراحت کو لفظوں کے جال میں بھی چھپا نہیں سکتی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عذرا اصغر ہمیشہ حقیقت کو لباس پہنا کر تیسری جنس بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ ویسی زندگی پیش کرنے والی فنکارہ ہیں جیسی انہیں نظر آتی ہیں۔ ان کی منفرد خوبی یہ بھی ہے' کہ انہوں نے ترقی پسند نقادوں سے اس لئے داد حاصل کی کہ وہ اپنے باطن کی سیاحت کرنے اور فطری رنگ نکھارنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں حلقوں نے عذرا اصغر کو ادب کی بلند مسند پر بٹھا دیا۔ چنانچہ ان کا نام ہندوستان کی افسانہ نگار زینت ساجدہ' صدیقہ بیگم سیہو ہاروی' جیلانی بانو' عصمت چغتائی اور پاکستان کی افسانہ نگار بانو قدسیہ' جمیلہ ہاشمی' ہاجرہ مسرور' فرخندہ لودھی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کہانیاں

Marfat.com

بنانے کا شوق پیدا ہوا تو ان کے سامنے شفیق الرحمان ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتے تھے۔اس رومانویت میں خواب ناک کیفیت حجاب امتیاز علی کی کہانیوں نے پیدا کی۔ان کو کرشن چندر کے طنزیہ افسانے بھی پسند آئے۔لیکن ان میں سے کسی کے فن کا پرتو عذرا اصغر کے افسانوں میں نہیں ملتا اور انہوں نے اردو افسانے میں اپنی کائنات خود تخلیق کی ہے اور اس کی فضا عام زندگی کی فضا سے منسلک ہے۔

عذرا اصغر کا پیدائشی نام مبارک شاہی بیگم تھا لیکن انہوں نے اپنا قلمی نام عذرا اختیار کیا اور شادی کے بعد ''عذرا اصغر'' موسوم ہوئیں۔وہ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۰ء کو دہلی کے محلہ حوض قاضی میں پیدا ہوئیں لیکن اپنے ادبی نام کے ساتھ کبھی ''دہلوی'' نہیں لکھا۔ان کے والد سید علمدار حسین زیدی پولیس میں اعلیٰ افسر تھے۔ان کے خاندان کے ایک اور بزرگ کرنل بشیر حسین زیدی ریاست رام پور میں وزیر اعلیٰ کے عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور بھارتی پارلیمنٹ کے رکن بھی بنائے گئے۔ادب کا ذوق فطری تھا۔تعلیم کا شوق گردوپیش نے پیش کیا۔انہوں نے بی اے تک تمام سرٹیفکیٹ پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر امتحان دے کر حاصل کئے اور افسانہ نگاری میں بھی کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔عورت ہونے کے ناطے کہانی سنانے کی صلاحیت انہیں قدرت نے عطا کی تھی' کہانی کو افسانہ بنانے کا فن ان کے مطالعے نے استوار کیا۔پہلی کہانی نو برس کی عمر میں لکھی جب وہ پاکستان میں ہجرت کر کے آ چکی تھی۔یہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔لیکن اس کہانی کی پذیرائی گھر میں کسی نے نہ کی تو یہ پودا مرجھانے لگا۔لیکن انہوں نے اس کی آبیاری اپنی مرضی سے کی۔آخر ان کی کامیابی کا پہلا سورج ۶ مئی ۱۹۶۵ء میں طلوع ہوا اور ان کی ایک کہانی اردو کے مشہور ترقی پسند جریدہ ''ادب لطیف'' میں کسی سفارش کے بغیر چھپ گئی۔اس کا عنوان ''ایک خواب' ایک حقیقت'' تھا۔اس وقت ''ادب لطیف'' کے ایڈیٹر انتظار حسین تھے۔جو اس رسالے کے لئے افسانوں کا بڑا کڑا انتخاب کرتے تھے۔عذرا اصغر ادب لطیف میں افسانے کی اشاعت کو اپنی کامیابی کا پہلا زینہ قرار دیتی ہیں اور اس کے بعد اسی دور کے مشہور رسائل کے

Marfat.com

دروازے عذرا اصغر پر کھل گئے اور شہرت ان کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلنے لگی لیکن میں ان کے انکسار سے متاثر ہوں۔ وہ مروت کو زندگی کا لازمی جزو سمجھتی ہیں اور بعض اوقات تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ اپنے افسانوں میں بھی درحقیقت ''دادی اماں'' کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ اور بدی اور برائی کے خلاف ان کا ذہن خوب چلتا ہے۔

عذرا اصغر کی ادبی زندگی کا یہ واقعہ بڑا اہم ہے کہ اردو کے نامور رسالہ ''تخلیق'' میں انہوں نے جناب اظہر جاوید کے ساتھ ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ وہ اس سے قبل رسالہ ''نورونار'' کی ادارت بھی کر چکی تھیں۔ ادبی مدیر کی حیثیت میں انہوں نے نئی لکھنے والی لڑکیوں کو ''تخلیق'' میں متعارف کرانے میں خصوصی دلچسپی لی۔ اور مرد افسانہ نگاروں کے ایسے افسانے اشاعت کے لئے قبول کئے جن میں عورت کی عظمت کا احساس کرایا گیا تھا اور اسے محض عضو معطل یا مرد کی باندی اور گھر کی نوکرانی نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان کے شوہر اصغر مہدی کو اسلام آباد تبدیل کر دیا گیا تو وہ لاہور چھوڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ حالانکہ وہ لاہور کو اپنا وطن بنا چکی تھیں۔ انہیں یہ بات بھی کھٹکی کہ اسلام آباد جا کر وہ ''تخلیق'' کے ساتھ ادارت کا عملی تعلق قائم نہ رکھ سکیں لیکن رسالے کی ادارت کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ

''چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی''

چنانچہ عذرا اصغر نے اسلام آباد سے اپنا ذاتی رسالہ ''تجدید نو'' جاری کیا جس کے بارے میں ایک نقاد نے لکھا تھا کہ یہ ''تخلیق'' کی دائیں پسلی سے پیدا ہوا ہے' چنانچہ ابتداء میں ''تجدید'' کو ادیبوں نے ''تخلیق'' کا اسلام آباد ایڈیشن قرار دیا اور اس کے ساتھ اسی طرح تعاون کیا جس طرح وہ اظہر جاوید صاحب کے ساتھ کرتے تھے لیکن پھر عذرا اصغر کی ادبی اور سماجی سرگرمیوں نے اسلام آباد میں اپنا ادبی حلقہ بنا لیا اور ''تجدید نو'' کی پالیسی سے عذرا اصغر اپنا رنگ نکھارنے لگیں۔ عذرا اصغر سے میری پہلی ملاقات اسلام آباد میں ہی ہوئی تھی، میں جب محترمہ نشاط فاطمہ کی وساطت سے اسلام آباد ان کے گھر گیا تو انہوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور پہلی

Marfat.com

ہی ملاقات میں اپنی تین کتابیں اشاعت کے لئے عنایت فرمادیں۔اصغر مہدی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوکر لاہور آ گئے تو ''تجدید نو'' نے بھی نقل مکانی کر لی۔لیکن اب ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی کہ اس رسالے کی ادارت میں عذرا اصغر کے ساتھ ان کی بیٹی شبہ طراز بھی شامل ہے' جو اردو افسانے اور شاعری میں نام پیدا کر چکی ہیں۔''تجدید نو'' کی انفرادیت یہ ہے کہ اسے دو خواتین جن میں ماں اور بیٹی کا ازلی اور ابدی رشتہ ہے' شائع کرتی ہیں۔اردو ادب میں ایسی مثال نظر نہیں آتی۔''تجدید نو'' دوسری نسل میں کامیابی سے چھپ رہا ہے' تو اسے عذرا اصغر کی تربیت کا فیضان سمجھنا چاہئے جو انہوں نے شبہ طراز کو دی ہے۔واضح رہے کہ عذرا اصغر کا بیٹا عنبر تاجور بھی افسانہ نگار ہے اور ان کے شوہر اصغر مہدی تو ادب کے ہر فن میں طاق تھے اور ان کی شاعری کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔دوسرا زیر اشاعت ہے۔گویا عذرا اصغر کا ذاتی کنبہ ادیبوں کا کنبہ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' افسوسناک بات یہ ہے کہ اصغر مہدی گزشتہ دنوں مختصر سی علالت کے بعد وفات پا گئے اور عذرا اصغر تنہا رہ گئیں' ان کی وفات کے بعد لاہور آئیں تو وہ بالکل بجھی بجھی سی نظر آئیں۔آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولیں ''ملک صاحب! زندگی کی ساری رونقیں اصغر کے دم سے تھیں۔میرا گھر میرے پوتے' پوتیوں' نواسے' نواسیوں' بہو اور داماد سے آباد ہے۔لیکن اب مجھے یہ گھر ویران نظر آتا ہے۔اور زندگی کے دن گزارنے مشکل ہو رہے ہیں''۔ عذرا اصغر کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا ''وقت آہستہ آہستہ مرہم بن جاتا ہے''۔عذرا اصغر بولیں۔''اور یادیں پھول بن جاتی ہیں' ساری عمر مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں تو اصغر کے عشق میں گرفتار تھی''۔

ان کے افسانوں کے چار مجموعے (پت جھڑ کا آخری پتہ.....بیسویں صدی کی لڑکی .....تنہا برگد کا دکھ..... اور گدلا سمندر) اور ناول ''دل کے رشتے ..... اور مسافتوں کی تھکن'' چھپ چکے ہیں۔مجھے فخر ہے کہ ''گدلا سمندر'' اور ''مسافتوں کی تھکن'' کے علاوہ تمام کتب میرے ادارے ''مقبول اکیڈمی'' سے شائع ہوئی ہیں۔انہیں پھل دینے والے پودوں

Marfat.com

اور خوشبودار پھولوں سے پیار ہے۔ان کے گھر کے آنگن میں ہمیشہ ایک باغ سجا ہوا' نکھرا ہوا اور خوشبو بکھیرتا نظر آتا ہے جس کی آبیاری عذرا اصغر خود کرتی ہیں۔سیر و سیاحت کا انہیں شوق ہے' ایک دفعہ ایران ہو کر آئی ہیں، لیکن سفر نامہ نہیں لکھا۔سنا ہے کہ کبھی کبھی شاعری بھی کر لیتی ہیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

Marfat.com

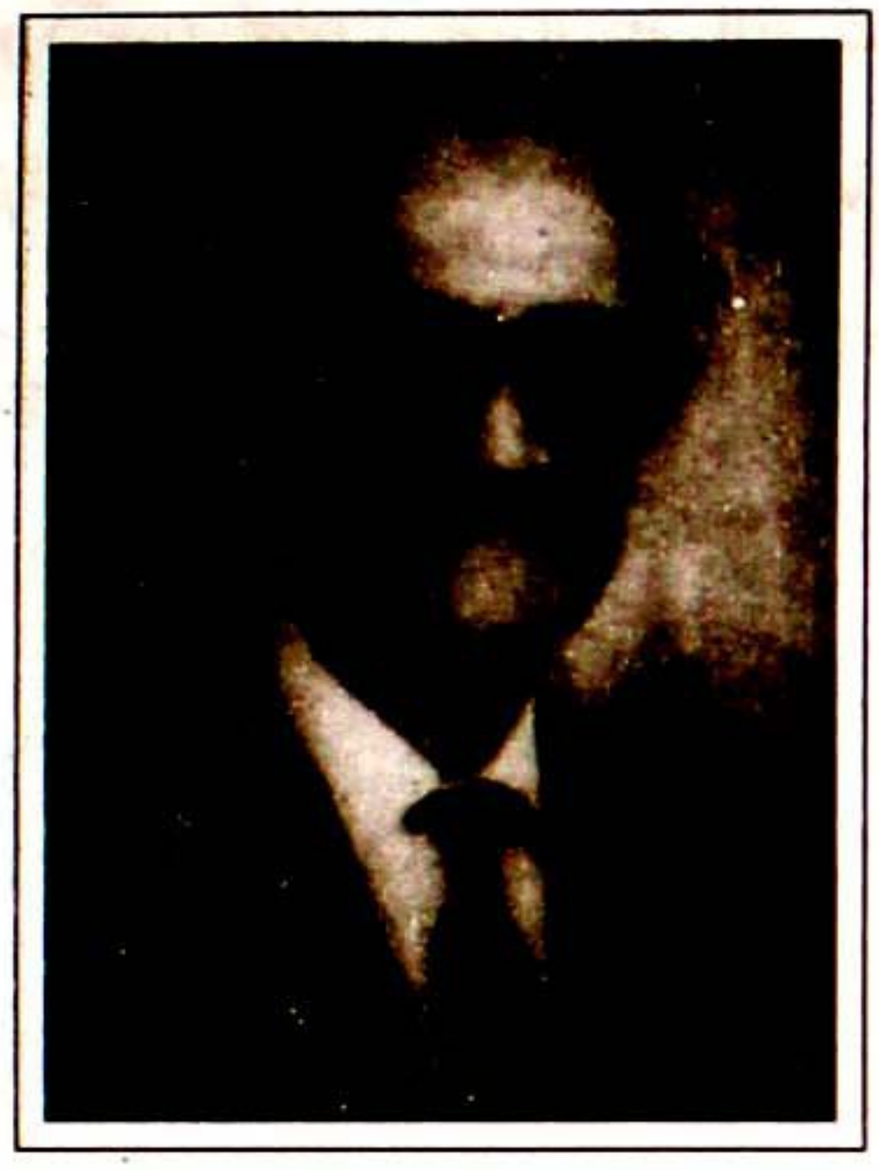

علی سفیان آفاقی

علی سفیان آفاقی سے ملیں تو احساس ہوتا ہے کہ آپ اگلے زمانے کے کسی بے حد نفیس الفطرت انسان سے مل رہے ہیں جو ناقدریٔ اور انسان ناشناسی کے اس دور میں آپ کا حقیقی قدرشناس ہے۔ باتیں کریں گے تو اتنی دھیمی آواز میں کہ آپ کو سننے کے لئے اپنے کان کھڑے کرنے پڑیں گے۔ میں نے انہیں کبھی قہقہہ مار کر ہنستے نہیں دیکھا اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انہوں نے چہرے پر سنجیدگی کی پختہ مہر لگا رکھی ہے' لیکن اپنی عینک کے عقب سے وہ دیکھتے ہیں تو اس میں محبت کی تمام چاشنی موجود ہوتی ہے اور ان سے مل کر حقیقی خوشی مل جاتی ہے۔

علی سفیان آفاقی بظاہر ایک شخص کا نام ہے لیکن عملی زندگی میں وہ کثیر الجہات شخصیت ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب ہیں' سفرنامہ نگار ہیں' صحافی ہیں یا فلم ساز ہیں۔ ان کی شخصیت میں یہ سب شعبے درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں اور اس کے ثبوت بھی انہوں نے فلموں اور کتابوں کی صورت میں فراہم کر رکھے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی سے بہت سے تجربات سمیٹے ہیں۔ فلم اور صحافت کی دنیا ان کے لئے ایک بہت بڑی لیبارٹری تھی' اس لیبارٹری میں وہ انسانوں کا تجزیہ کرتے تھے اور جو نتائج نکلتے انہیں اپنے حافظے میں محفوظ کرتے جاتے۔ اب

Marfat.com

یہ داستان ''الف لیلیٰ'' سے کم دلچسپ نہیں اور علی سفیان آفاقی صاحب اسے قسط وار اپنے رسالہ ''فیملی میگزین'' میں چھاپ رہے ہیں۔اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے یہ داستان پڑھتے ہیں جس میں فلمی اور ادبی دنیا کی شخصیات سے ملاقات کرائی جاتی ہے۔وہ لوگ جو منظر حیات سے ہٹ چکے ہیں۔انہیں علی سفیان آفاقی نئی زندگی عطا کر رہے ہیں۔

علی سفیان آفاقی وسط ہند کی مسلم ریاست بھوپال کے شہر شیہور میں پیدا ہوئے تھے۔تعلیم بھوپال اور میرٹھ میں حاصل کر رہے تھے کہ پاکستان معرض وجود میں آ گیا اور بھوپال کی مسلم ریاست کے حالات دگرگوں ہو گئے۔ویسے بھی انہیں کانگریس کی سیاست پسند نہیں تھی اور وہ مسلمانوں کے لئے آزاد خطۂ وطن حاصل کرنے کے حامی تھے۔اس ابتدائی دور میں ہی انہیں اخبارات پڑھنے کی عادت پڑ گئی۔ان کی دوسری دلچسپی کہانیوں سے تھی۔گویا ادب اور صحافت کی طرف ان کا رجحان آغاز میں ہی ترتیب پا گیا تھا۔پاکستان آئے تو سب سے پہلے انہوں نے بی اے آنرز کا امتحان پاس کیا۔اس کے ساتھ ہی تلاش معاش میں نکلے تو صحافت نے ان کا دامن تھام لیا۔ان کو صحافت کی دنیا میں پہلی ملازمت جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار روزنامہ ''تسنیم'' میں ملی۔آفاقی صاحب کہتے ہیں کہ اس اخبار کا ایک خاص مزاج تھا۔جو قول و فعل کے تضاد کو ختم کر دیتا تھا۔آفاقی صاحب کو بے باکی، حق گوئی اور اظہار کی جرأت مندی صحافت کے اس تجربے نے ہی دی جو بعد میں ان کے لئے ہمیشہ راہنما ثابت ہوئی۔بالخصوص فلم کی دنیا میں ان کا واسطہ مختلف قسم کے لوگوں سے تھا لیکن آفاقی صاحب اپنی صادق قدروں کو عزیز رکھتے تھے۔چنانچہ فلم کے لوگ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔

''تسنیم'' بند ہوا تو انہوں نے پہلے ہفت روزہ ''چٹان'' میں کام کیا جو ان دنوں شورش کاشمیری کی ادارت میں نکلتا تھا اور اس دور کے ہفت روزہ ''اقدام'' اور ''قندیل'' کے ساتھ بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔روزانہ صحافت کا سابق تجربہ انہیں اخبار ''نوائے وقت'' میں لے آیا جو حمید نظامی کی ادارت میں حق گوئی اور بے باکی کی مثال تھا اور جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق بلند

Marfat.com

کر رہا تھا۔ آفاقی صاحب نے یہاں بھی قیمتی تجربات سمیٹے لیکن ایک نیا تجربہ انہیں اخبار ''آفاق'' میں حاصل ہوا جس کے مینجنگ ایڈیٹر میر نور احمد تھے۔ انہوں نے روزنامہ ''صحافت میں فلمی صفحے کا اضافہ کیا۔ ''امروز'' میں ادبی صفحہ چراغ حسن حسرت نے متعارف کرایا تھا۔ فلمی صفحے کی ابتداء ''آفاق'' نے کی اور اس تجربے کو کامیاب بنانے میں آفاقی صاحب کے زرخیز دماغ کا جوہر خوب کام آیا۔ آفاقی صاحب نے اس اخبار میں پروفیسر محمد سرور جامعی اور مولانا غلام رسول مہر کے ساتھ کام کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی سیماب مزاجی نے انہیں کہیں ٹک کر بیٹھنے نہیں دیا۔ ''آفاق'' کے بعد انہوں نے م۔ش (میاں محمد شفیع) کے رسالہ ہفت روزہ ''اقدام'' اور منصور علی خان کے روزنامہ ''آثار'' کی ادارت کی۔ آفاق' نوائے وقت' امروز' احسان، جنگ اور نگار میں ''دام خیال'' اور ''دریچے'' کے عنوان سے کالم نگاری کی۔ انگریزی اور اردو کے اخبارات میں مضامین لکھے' نامور لوگوں کے انٹرویوز کئے۔ فیچر نویسی میں نام پیدا کیا۔ ان کے کالم اور فیچر ہندوستان کے متعدد اخبارات میں نقل کئے جاتے تھے۔ ان سب تجربات کو انہوں نے پہلے ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں استعمال کیا اور اب ایک لمبے عرصے سے ''فیملی میگزین'' میں کام کر رہے ہیں جو ملک کا ایک ایسا پرچہ ہے جس میں خاندان کے ہر فرد کے لئے کچھ مواد ضرور مل جاتا ہے' اس پرچے کے ہر صفحے پر علی سفیان آفاقی کی ذاتی مہر ثبت ہوتی ہے اگرچہ لکھنے والوں کا حلقہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے۔

علی سفیان آفاقی کی شخصیت کا عملی زاویہ فلم کے شعبے میں بھی خوب نمایاں ہوا ہے۔ انہیں فلم میں دلچسپی ''آفاق'' کی صحافت کے دور میں ''فلمی صفحہ'' کے اجراء پر ہو گئی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں شباب کیرانوی نے جو خود بھی صحافی تھے فلم ''ٹھنڈی سڑک'' بنائی تو اس کی کہانی' مکالمے اور منظر نامہ آفاقی صاحب سے لکھوایا۔ یہ طنزیہ اور مزاحیہ فلم تھی جو باکس آفس پر تو کامیاب نہ ہوئی۔ لیکن آفاقی صاحب کے قلم کی دھاک بیٹھ گئی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء میں انہوں نے صحافت سے قطع تعلق کر لیا لیکن فلمی دنیا نے ان کا خیر مقدم خوش دلی سے کیا۔ ۱۹۵۷ء

Marfat.com

سے لے کر ۱۹۹۲ء تک انہوں نے لا تعداد فلموں کے مکالمے' کہانیاں اور سکرین پلے لکھے اور ''کنیز'' ''میرا گھر میری جنت'' اور ''سزا'' جیسی کامیاب فلمیں خود پروڈیوس کیں۔ فلمی دنیا میں گزارے ہوئے پندرہ سال ان کی عملی زندگی کے کامیاب ترین سال ہیں لیکن آفاقی صاحب بنیادی طور پر ادیب تھے چنانچہ مجید نظامی صاحب نے ادارہ ''نوائے وقت'' کے زیر اہتمام ''فیملی میگزین'' جاری کیا تو ان کی نگاہ انتخاب علی سفیان آفاقی پر پڑی جو ''ہر فن مولا'' تھے۔ لفظوں کے شہنشاہ تھے اور ایک ''فیملی'' میگزین کے لئے ہر طرح سے موزوں تھے۔ اور اب کہا جا سکتا ہے' کہ اس میگزین کی کامیابی دراصل علی سفیان آفاقی کی کامیابی ہے' جنہیں ہر ہفتے متنوع اور دلچسپ پرچہ پیش کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

میں نے علی سفیان آفاقی کو لفظوں کا شہنشاہ کہا ہے تو غلط نہیں کہا۔ فلم کے ساتھ وابستگی نے انہیں ملکوں ملکوں کی سیاحت کرنے کے مواقع عطا کئے تو انہوں نے اپنے مشاہدات کو ضائع نہیں ہونے دیا اور وطن واپس آتے ہی دیکھے ہوئے ملک کا سفر نامہ لکھ ڈالتے۔ انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی سوانح عمری لکھی۔ سیاستدانوں اور دانشوروں کے انٹرویوز شائع کئے۔ میرا ایک انٹرویو بھی فیملی میں شائع کیا۔

طنزیہ و مزاحیہ مضامین کی کتابیں تالیف کیں اور ہر شعبے میں دسیوں بلکہ بیسیوں ایوارڈ حاصل کئے۔ میں نے ان کے ڈرائنگ روم میں ان ایوارڈوں کو سجا ہوا دیکھا۔ گننے کی کوشش کی تو گن نہ سکا۔ یقیناً ان کی تعداد آفاقی صاحب کی عمر کے برسوں سے زیادہ ہے۔

علی سفیان آفاقی کی سلسلہ در سلسلہ کامیابیوں کی یہ داستان میں نے اس لئے پیش کی ہے کہ آج کے نوجوان کو اس حقیقت کا علم ہو کہ محنت میں کتنی برکت ہے۔ اور آفاقی صاحب نے بے نیازی اور استغناء میں اپنی خودی اور خودداری کو قائم رکھا تو انہیں خالق حقیقی نے کیسے کیسے انعامات سے نوازا۔ مجھے وہ دن یاد ہے' جب میں علی سفیان آفاقی سے ملاقات کا ارادہ کر کے گھر

Marfat.com

سے نکلا تھا اور ذہن میں ان سے مقبول اکیڈمی کے لئے کوئی کتاب حاصل کرنے کا خیال بھی تھا۔ آفاقی صاحب ملے تو مجھے ان کی تہذیبی شخصیت نے سرشار کر دیا۔ ان کے چہرے پر متانت طاری تھی لیکن عینک کے عقب سے آنکھیں انکسار سے جھکی جاتی تھیں' انہوں نے استری شدہ نفیس کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔ لیکن مجھے یوں محسوس ہوا کہ ان کا لباس ان کے جسم کی ضرورت تھی' جسم کی زیبائش نہیں تھی اور جو شخص میرے ساتھ ہم کلام تھا وہ درحقیقت کرسی پر بیٹھا ہوا بھی بوریہ نشین ہی محسوس ہوتا تھا۔ مجھے ان کے لباس اور ذہن میں بے ترتیبی نظر آئی لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جسم اور روح ہم آہنگ ہیں اور اپنے فن کی اقلیم کے لئے محمود ہیں جس میں ایاز کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ اس ایک ملاقات میں جو نقش میرے دل پر قائم ہوا۔ وہ اب تک مستقل طور پر قائم ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آفاقی صاحب کے داخل اور خارج کا ایک ہی رنگ ہے اور یہ رنگ امٹ ہے۔ مجھے ان کے ناشر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ میں نے ان کی تقریباً پندرہ کتابیں شائع کی ہیں۔ لیکن ہمارے درمیان کاروباری گفتگو کبھی نہیں ہوئی اور انہوں نے پیشہ ور مصنفوں کا جو ناشر کی دیانت کو ہمیشہ شکوک وشبہات سے دیکھتے ہیں' کبھی رویہ اختیار نہیں کیا' میں جب بھی ملاقات کے لئے ان کے گھر پر حاضر ہوا تو انہوں نے ہمیشہ تواضع سے فیضاب کیا۔ بھابھی محترمہ بہترین ''قہوہ'' یا ''کافی'' بنا کر لاتی ہیں تو اس میں سبز پتی وغیرہ کے ساتھ ''خلوص'' ملا دیتی ہیں جس سے ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اللہ کریم انہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ (آمین) مصروفیت کی وجہ سے ملاقات کا وقفہ اگر کبھی طویل ہو جائے تو آفاقی صاحب ٹیلی فون پر پیار بھری ڈانٹ پلا دیتے ہیں کہ ''یار تم تو بڑے بے وفا نکلے ہو''..... میں ان کا نیاز مند ہوں اور ان کا بے حد مداح ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے علی سفیان آفاقی جیسا بے حد مخلص دوست عطا کیا ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ کریم آفاقی صاحب کو صحت مند توانا رکھے اور ان کے قلم کی روانی قائم رہے۔

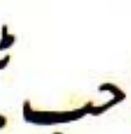

Marfat.com

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

میانوالی کے صحرائی علاقے میں کندیاں کو ریلوے جنکشن کی حیثیت حاصل ہے۔اس قصبے میں غفور شاہ قاسم پیدا ہوئے تو اس کی شہرت اردو ادب میں بھی پھیل گئی۔اس دور افتادہ مقام پر بیٹھ کر غفور شاہ قاسم نے ایسی کتابیں لکھ دیں جن کا تذکرہ لاہور کے ادیبوں نے خوشدلی سے کیا۔ان کے نام یہ ہیں۔..... ''پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء تا حال'' ..... اور ''پاکستانی ادب''..... ''شناخت کی نصف صدی'' ان کتابوں میں غفور شاہ قاسم نے پاکستانی ادب کا جائزہ غیر جانبداری سے لیا اور ایسے ادیبوں کی خدمات کا اعتراف بھی کیا جنہیں بڑے شہروں کے نقاد گھاس نہیں ڈالتے تھے۔اب ان ادیبوں کے نام طلبہ کی زبان پر ہیں اور ان پر ایم اے اور ایم فل کے مقالات بھی لکھے جا رہے ہیں جن کا بنیادی ماخذ غفور شاہ قاسم کی کتابیں ہیں۔

غفور شاہ قاسم کندیاں ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اس قصبے کے ٹاٹ سکولوں میں حاصل کی اور ایم اے تک پہنچ گئے۔عملی زندگی کی ابتداء پی اے ایف کالج میانوالی کے شعبۂ اردو سے کی جہاں انہوں نے طلبا میں ادب کا ذوق پیدا کرنے کیلئے خصوصی خدمات انجام دیں،جن طلبا میں شعر کہنے کی صلاحیت تھی ان کو اردو نثر پڑھنے اور لکھنے پر آمادہ کیا اور ان کے جوہر کو

Marfat.com

خوب چمکایا۔دوسری طرف خود تنقید و تحقیق کی طرف آ گئے، تعلیم کی توسیع کا سلسلہ جاری رکھا اور ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی بھی کر لی۔ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ''حجاب امتیاز علی تاج کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ'' تھا۔اس سے قبل وہ ایم اے کے لئے تحقیقی مقالہ'' ملک منظور حسین ''احوال و آثار'' لکھ چکے تھے جسے ڈاکٹر وحید قریشی نے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے شائع کیا۔ڈاکٹر غفور شاہ قاسم ان دنوں ایف سی کالج یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ ہیں۔جہاں وہ طلبا کو ادب کی تعلیم دینے کے علاوہ ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم طبعاً سادہ مزاج' سادہ دل اور سادہ طبع ہیں' میانوالی کے صحراؤں نے ان کے دل میں کشادگی اور وسعت پیدا کی ہے اور وہ نبی نوع انسان کو اخلاقیات کی اعلیٰ ظرفی کا سبق دیتے ہیں اور اس معیار پر خود بھی عمل کرتے ہیں۔ان کے طلبا ان کی بے پایاں عزت کرتے ہیں۔ان کا مثبت نقطۂ نظر ان کے تنقیدی مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔بلاشبہ وہ ادب میں غلطی ہائے مضامین کی نشاندہی کے زبردست داعی ہیں لیکن اختلافی نکتہ بھی شائستگی سے ابھارتے ہیں اور دوستداری کی فضا کو قائم رکھتے ہیں۔

مقبول اکیڈمی کی متعدد کتابوں پر انہوں نے جو تبصرے کئے ہیں وہ ان کی تنقیدی وضعداری کے آئینہ وار ہیں اور ان کے مزاج کی مشرقیت اور علم دوستی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ادب ان کی زندگی کی اہم ترین سرگرمی ہے اور کتاب سے جو محبت بچپن میں پیدا ہوئی تھی وہ اب عشق کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ان کی طبیعت کی فیاضی کا ثبوت مختلف کتابوں پر ان کے پیش الفاظ ہیں جن کی معنویت مصنف کو ذہنی آسودگی اور طمانیت عطا کرتی ہے اور تنقید کے اس نئے نام سے اردو ادب نے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں اور ہم ان کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔

Marfat.com

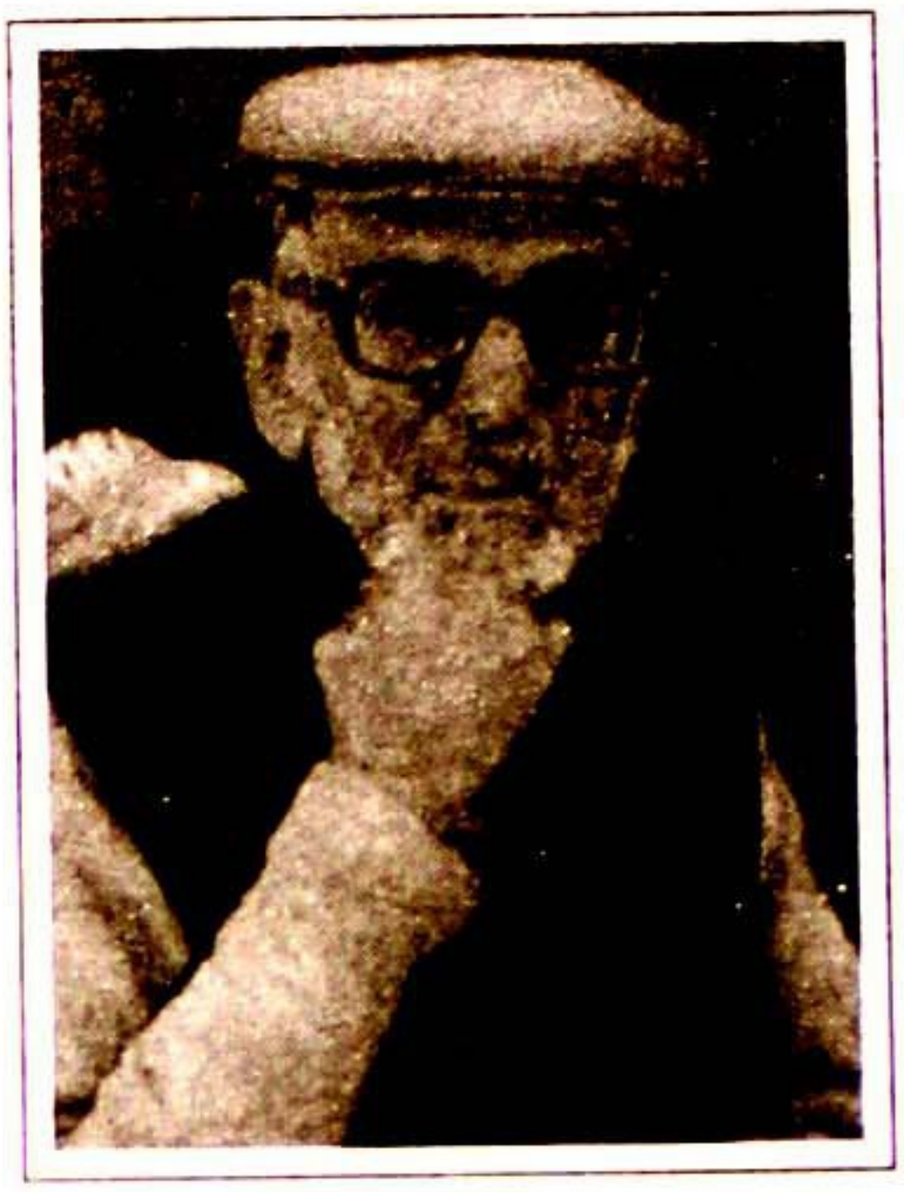

غلام الثقلین نقوی

اردو کے شریف ترین ادیبوں کی مختصر ترین فہرست بھی بنائی جائے تو اس میں سید غلام الثقلین نقوی کا نام ضرور شامل ہوگا۔ وہ جب گلے میں مفلر ڈال کر مقبول اکیڈمی پر تشریف لاتے تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ مولانا الطاف حسین حالی نے قدم رنجہ فرمایا ہے۔ مقبول اکیڈمی ان کی آمد سے مہک اٹھتی۔ ایک واقعے کی یاد مجھے آتی ہے' تو میں خود بخود مسکرانے لگتا ہوں۔ میں نے ''مسدس حالی'' کا ایک ایڈیشن شائع کیا تو ایک دن غلام الثقلین نقوی آ گئے۔ میں نے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ ان دنوں ان کی کتاب ''سرگوشی'' میرے ادارے میں زیر اشاعت تھی۔ میں نے نقوی صاحب کو دیکھتے ہی کہا!

''آیئے آیئے نقوی صاحب آپ کی کتاب چھپ گئی ہے؟''

خوشی سے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ میں نے بھی ان کے اشتیاق سے مزہ لیا اور اٹھ کر کتاب پیش کی۔ دیکھ کر بولے۔

''یہ تو ''مسدس حالی'' ہے!

میں نے جواب دیا۔ ''نقوی صاحب! آپ ہمارے عہد کے مولانا حالی ہیں۔ میں

Marfat.com

نے یہ تاثر آپ کی کتاب ''سرگوشی'' پڑھ کر قائم کیا''۔

نقوی صاحب نے میری بات کا نہ برا منایا اور نہ پسند کیا صرف یہ کہا۔

''کہاں مولانا الطاف حسین حالی اور کہاں غلام الثقلین نقوی۔

میں نے اسی وقت ان کی کتاب کا ایک نسخہ پیش کر دیا تو ان کی آنکھیں دوبارہ خوشی سے چمک اٹھیں اور میرے ساتھ گلے ملنے کے لئے کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

غلام الثقلین نقوی ان دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ کبھی کبھی بی اے کی کلاس کا آخری پیریڈ پڑھا کر کالج سے نکلتے تو اردو بازار عبور کر کے مقبول اکیڈمی پر بھی تشریف لے آتے جہاں بعض اوقات دو چار نئے لکھنے والے ادیب بھی بیٹھے ہوتے۔

نقوی صاحب ہر ایک کا حال احوال محبت سے پوچھتے اور پھر ان کے ساتھ ان کی تخلیقی سرگرمیوں پر باتیں کرنے لگتے۔ میں نے ایک دن پوچھا ''نقوی صاحب! آپ نوجوان لکھنے والوں میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں جبکہ ان میں سے کسی نے آپ کی ایک کتاب بھی کبھی نہیں خریدی، نہ پڑھی ہے''۔ نقوی صاحب میری بات سن کر سنجیدہ ہو گئے اور بولے۔

''میں بنیادی طور پر استاد ہوں۔ جہاں نوجوانوں کو دیکھتا ہوں میرے اندر کا استاد بیدار ہو جاتا ہے اور میں ''کلاس'' لگا لیتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ان نوجوانوں میں ادب کا ذوق پیدا ہو جائے، شاید ان میں مستقبل کا کوئی بڑا ادیب چھپا ہوا ہو''۔

مجھے ان کی یہ بات اچھی لگی کہ وہ گمراہی کے دور میں نوجوانوں کے ذوق کی تربیت کر رہے تھے۔

غلام الثقلین نقوی ریاست جموں و کشمیر کے ایک گاؤں چوکی پنڈت میں ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے' ان کے خاندان میں پیری مریدی' اور دم درود کا سلسلہ چلتا تھا۔ ان کے خاندان کے مرید پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے والد سید احمد شاہ نے مڈل تک

Marfat.com

تعلیم حاصل کرنے کے بعد ریاست کشمیر میں پٹواری کی نوکری اختیار کر لی۔ جب ان کا بڑا بیٹا غلام الثقلین نقوی تین سال کا ہوا تو انہوں نے پٹوار چھوڑ دی اور رزق حلال کی تلاش میں سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں بھرتھ میں آ گئے۔ سید امیر شاہ نے ان ٹرینڈ ٹیچر کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ملازمت کے دوران ہی انہوں نے منشی فاضل کیا اور بی اے بی ٹی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ انہیں افسانہ پڑھنے کا شوق تھا۔ کرشن چندر ان کا محبوب مصنف تھا۔ غلام الثقلین نقوی کو بھی تعلیم کے دوران ہی کہانیاں پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ ایف اے مرے کالج سیالکوٹ سے کرنے کے بعد انہوں نے ملٹری اکاؤنٹس میں نوکری حاصل کر لی لیکن اس ملازمت پر ان کا دل نہ لگا اور اسے ترک کر کے وہ بھی سکول ٹیچر بن گئے۔ ایم اے تک امتحانات پرائیویٹ طور پر پاس کئے سنٹرل ٹریننگ کالج سے بی ٹی کی ڈگری حاصل کی اور سکول میں پڑھانے لگے۔ جب پنجاب میں اردو کو لازمی مضمون کا درجہ ملا تو نقوی صاحب کو لیکچرار لگا دیا گیا۔ انہوں نے جھنگ اور بہاولنگر کے کالجوں میں استاد اردو کی خدمات انجام دیں اور پھر لاہور سنٹرل ٹریننگ کالج میں آ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کو گورنمنٹ کالج لاہور میں تبدیل کر دیا گیا اور یہیں سے ساٹھ سال کی عمر پوری ہونے پر اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔

نقوی صاحب نے قلم اور قرطاس کے ساتھ اپنا مضبوط رشتہ مرے کالج کے زمانے میں ہی قائم کر لیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے افسانے ''ماہ نو'' اور ''ادب لطیف'' اور ''ادبی دنیا'' میں چھپنے لگے۔ اسی دور میں سید احتشام حسین اور سید وقار عظیم نے ان کے افسانوں کا ذکر اپنے تنقیدی مضامین میں کیا تو نقوی صاحب نے اسے دو بڑے ادیبوں کی حوصلہ افزائی قرار دیا۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنا رسالہ ''اوراق'' شروع کیا تو نقوی صاحب کو اس پرچے میں ہمیشہ نمایاں جگہ دی۔ اسی دوران انہوں نے رابطہ نگاری' سفر نامہ نگاری اور طنز و مزاح اور کالم نگاری میں بھی قلم آزمائی کی اور ہر صنف میں کامیاب مصنف قرار دیئے گئے۔ ۱۶ اپریل ۲۰۰۳ء کو وفات پائی

Marfat.com

توان کے افسانوی کے سات مجموعے چھپ چکے تھے۔جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔بندگلی ۲۔شفق کے سائے ۳۔نغمہ اور آگ ۴۔لمحے کی دیوار

۵۔دھوپ کی دیوار ۶۔سرگوشی ۷۔نقطے سے نقطے تک۔

ان کا ایک ناول ''میرا گانوں'' اور تین ناولٹ ''شمیرا''.....''چاند پور کی نیتا'' اور ''شیر زمان'' بھی شائع ہو چکے تھے۔''ارض تمنا'' مکے اور مدینے کا اور ''چل بابا اگلے شہر'' ''انگلستان کا سفر نامہ ہے۔ان کے لطیف مزاح کا زاویہ ان کی کتاب ''اک طرفہ تماشا'' میں ابھرا ہے۔ان کے کالموں کا مجموعہ ''پانچواں طبقہ'' کی نام سے شائع ہو چکا ہے۔

نقوی صاحب بنیادی طور پر دیہات نگار ہیں' لیکن لاہور جیسے بڑے شہر کے تجربات کو بھی انہوں نے اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں!

غلام الثقلین نقوی نے دیہات کے کرداروں کو بڑی نفاست' خلوص اور جذبے کے ساتھ پیش کیا ہے.....''درانتی' کدال' پانی' ہوا اور مٹی وغیرہ کو بھی موضوع بنایا ہے.....نقوی صاحب نے ان کرداروں کی ان دونوں پرتوں کے باہمی رشتے کو دریافت کر کے دیہات کو ایک نامیاتی کل کے طور پر پیش کیا ہے''۔

میرزا ادیب' رحمان مذنب' پرنسپل غلام جیلانی اصغر' ڈاکٹر سہیل بخاری' پروفیسر سجاد نقوی اور متعدد ممتاز نقادوں نے ان کے فن کو سراہا اور اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین فخر زمان صاحب نے ان کو'' پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے میں شامل کیا اور ان کی شخصیت اور فن پر ڈاکٹر انور سدید سے ایک کتاب لکھوائی تو اس کے پیش نامے میں نقوی صاحب کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

''غلام الثقلین نقوی ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم اور انتہائی لائق توجہ باب ہیں۔انہوں نے اردو ادب کو بے حد وقیع بنایا اور علم و ادب میں بہت قابل قدر اضافے کئے۔ان

Marfat.com

کی تحریروں میں حقیقت نگاری کا غیر معمولی اہتمام ہے"۔

مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ غلام الثقلین نقوی جیسا عظیم فن کار، انسان دوست اور اقدار پسند انسان سے میرا ناتہ کا نہیں، دوستی کا رشتہ تھا۔ ان کی دو کتابیں "سرگوشی" اور "چل بابا اگلے شہر" میرے ادارے سے شائع ہوئیں، ان کی وفات سے اردو کا ایک بڑا افسانہ نگار ہی رخصت نہیں ہو گیا بلکہ ایک بڑا انسان بھی دنیا سے اٹھ گیا ہے، غلام الثقلین نقوی یاد آتے ہیں تو یہ میرے دل سے دعا نکلتی ہے کہ اللہ انہیں مغفرت عطا فرمائے۔

Marfat.com

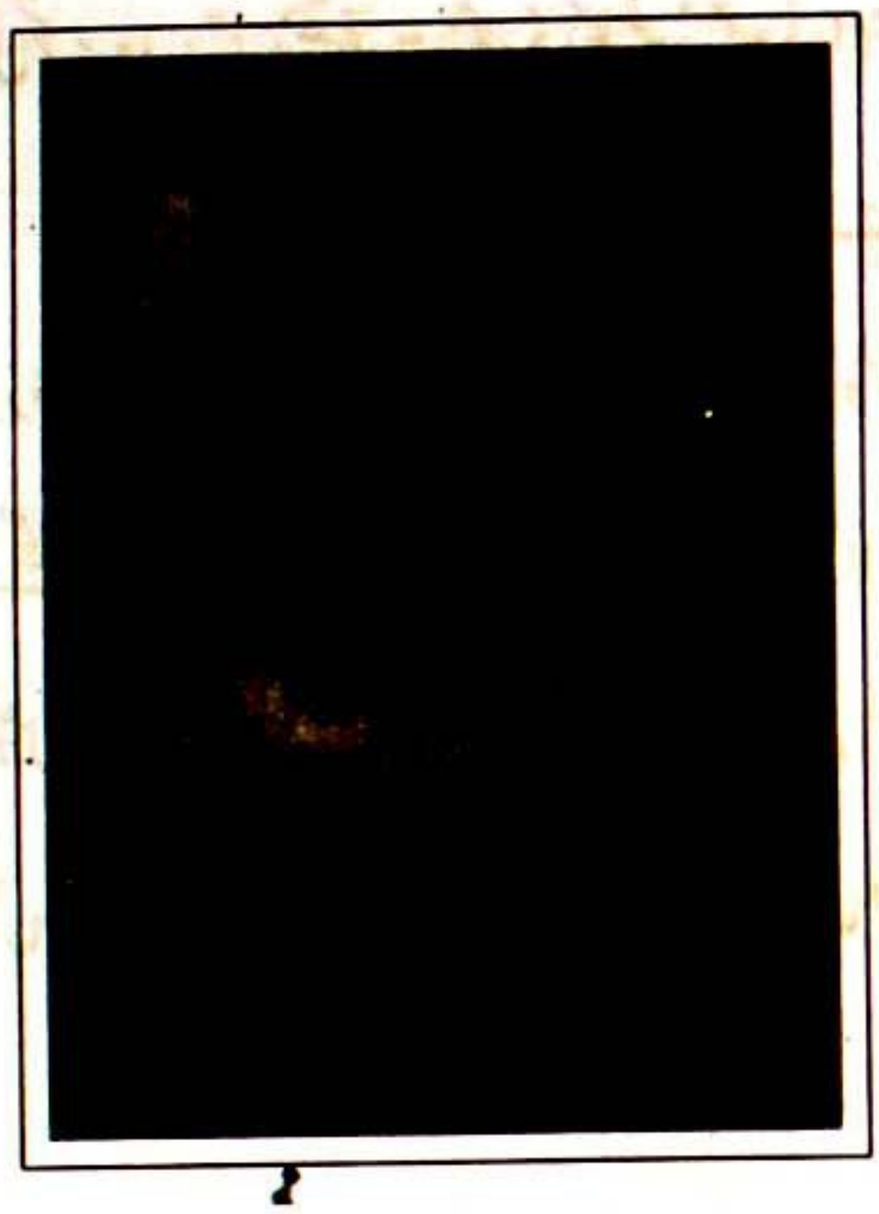

سید قاسم محمود

سید قاسم محمود کا نام زبان پر آئے تو ایک ایسے ادیب کی پوری زندگی کی فلم آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتی ہے جس کا دن ۲۴ گھنٹوں کا اور رات ۴۸ گھنٹوں کی تھی اور وہ ان میں سے ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتے تھے اور تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتے تو کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتے، کاغذ اور قلم دائیں طرف رکھا ہوتا۔ ضخیم کتاب سے معلومات کا ذخیرہ کاغذوں پر لکھتے جاتے۔ تھوڑے سے عرصے کے بعد ان کی کوئی نئی انسائیکلو پیڈیا منظر عام پر آ جاتی۔

بلاشبہ سید قاسم محمود انسائیکلو پیڈیائی قلم کار تھے لیکن انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا تخلیق کاری سے کی۔ افسانے اور ناول میں نام پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ترجمہ نگاری کی طرف آ گئے اور انگریزی کے کئی شاہکار ناول اور کتابیں اردو میں پیش کر دیں۔

سید قاسم محمود کی پوری زندگی محنت اور مسلسل محنت کا نام ہے۔ وہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو متحدہ پنجاب کے ضلع روہتک کے ایک چھوٹے سے گاؤں کھرکھوہ میں پیدا ہوئے۔ مڈل تک تعلیم ٹاٹ مدرسوں میں حاصل کی۔ پاکستان کی جدوجہد میں انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی شرکت

Marfat.com

شروع کر دی تھی اور اپنے ضلع روہتک میں بچوں کی لیگ بنائی تھی۔ پھر مشرقی پنجاب میں آزادی کے ہنگامے شروع ہو گئے اور قاسم محمود اپنے باپ سے بچھڑ گئے۔ اس وقت وہ میٹرک کا امتحان صوبے میں اول رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے پاس کر چکے تھے۔

باپ کی جدائی کا صدمہ شدید تھا اور اس کے ساتھ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے انہیں نوکری کی تلاش تھی۔ قاسم محمود ۱۹۴۶ء میں دہلی آ گئے تھے۔ مکتبہ جامعہ اور ہمدرد دواخانہ میں معمولی نوکری اختیار کر لی، اسی دوران آزادی کے ہنگامے شروع ہو گئے تو انہوں نے دہلی میں پاکستان کی طرف آنے والے مسلمانوں کے کیمپوں میں خدمات انجام دیں۔ لٹے پھٹے لاہور پہنچے تو لاہور میں والٹن اور مہاجر کیمپوں میں مہاجرین کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ قومی حالات قدرے بہتر ہوئے تو قاسم محمود نے محنت مزدوری شروع کر دی، صبح کے وقت اخبار بیچتے، پھر بجلی کی لائنیں درست کرنے کے لئے سیڑھی اٹھا کر گلی گلی پھرتے۔

ادب کا شوق انہیں زمیندار کے دفتر لے گیا اور قاسم محمود اظہر امرتسری اور حاجی لق لق کے معاون بن گئے۔ حاجی لق لق نے ہی انہیں آسٹریلیا مسجد میں نمازیوں کے جوتوں کی حفاظت پر لگا دیا۔ یہیں ایک دن ان کی ملاقات اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے ہو گئی اور اب پھر خاندان اکٹھا ہو گیا۔

قاسم محمود نے اس ابتدائی دور میں کئی ملازمتیں کیں، حافظ محمد عالم کے رسالہ ''عالمگیر'' اور ''خیام'' کی ادارت کی، ریلوے بک سٹال پر کتابیں اور رسالے بیچے، پنجاب یونیورسٹی میں کلرکی کی۔ ''دائرہ معارف اسلام'' میں علامہ مولوی محمد شفیع کے ساتھ کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ادیب فاضل کا امتحان پاس کرنے کے بعد پہلے ایف اے اور بی اے انگریزی میں کیا۔ اس دوران انہوں نے حکومت پنجاب کی ''مجلس زبان دفتری'' میں مترجم کی حیثیت میں ملازمت اختیار کر لی لیکن ۱۹۵۶ء میں سرکاری ملازمت ترک کر دی اور ایک آزاد قلم کار کی حیثیت میں میدان ادب میں کود پڑے اور نئے نئے تجربے کرنے لگے۔ انہوں نے پہلے عابد علی عابد کے ساتھ

Marfat.com

ہفت روزہ ''صادق'' نکالا، پھر مجلس ترقی ادب کے رسالہ ''صحیفہ'' میں ان کی معاونت کی۔ان کی تنظیمی اور ادبی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں حلقۂ ارباب ذوق کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔''لیل ونہار'' جاری ہوا تو انہوں نے فیض احمد فیض اور سید سبط حسن کے ساتھ ''جنگ آزادی ۱۹۵۷ء نمبر'' ترتیب دیا اور ''لیل ونہار'' کی ادارت میں ان کی معاونت کی۔سید قاسم محمود نے ممتاز ادبی جریدہ ''ادب لطیف'' کو بھی اپنے ادارتی ہاتھوں سے سنوارا۔

سید قاسم محمود کی ادبی شخصیت کی بے شمار جہتیں ہیں۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''قاسم کی مہندی'' کے نام سے شائع ہوا اور اس پر ''اوراق'' ''فنون'' اور نقوش جیسے رسائل میں شاندار تبصرے شائع ہوئے۔''دیوار پتھر کی'' قاسم محمود کے افسانے اور پنڈت جلال الدین نہروان کے افسانوں کے دیگر مجموعے ہیں۔''چلے دن بہار کے'' ان کے ناول کا نام ہے' جس پر محمد خالد اختر نے ''فنون'' میں تبصرہ کیا۔سید قاسم محمود کا ایک منفرد اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے کتب بینی کے فروغ کے لئے رسالہ ''کتاب'' جاری کیا جو اب تک مختلف مدیران کے زیر اہتمام جاری ہے۔ انہوں نے اشاعت کے وسیع تر پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے اپنا ادارہ ''شیش محل کتاب گھر'' قائم کیا۔جس نے اردو ادب کی متعدد اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع کیں۔پاکستان میں ڈائجسٹوں کا دور شروع ہوا تو قاسم محمود نے ''سیارہ ڈائجسٹ'' کی بنیاد رکھی، یہ رسالہ بھی اب تک شائع ہو رہا ہے اور ملک میں بے حد مقبول ہے۔

پاکستان میں جب سب کچھ مہنگا ہو گیا تھا تو قاسم محمود نے سستی کتابوں کی اشاعت کے لئے ''شاہکار کتب'' کا سلسلہ جاری کیا۔اس مکتبہ کی کتابیں عام اخبارات کے سٹالوں پر فروخت ہوتی تھیں۔انہوں نے ۱۹۷۶ء میں پندرہ روزہ ''قافلہ'' کے نام سے سیاسی جہت کا ایک رسالہ جاری کیا جس نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کی ۱۹۷۷ء میں شدید مخالفت کی۔قاسم محمود حکومتی حلقوں میں معتوب گردانے گئے اور لاہور میں قیام ناممکن بنا دیا گیا۔چنانچہ انہوں نے اپنا تمام اشاعتی کاروبار بند کر دیا اور کراچی چلے گئے۔

Marfat.com

کراچی میں انہوں نے ''عالمی ڈائجسٹ'' کے ادارے میں شرکت اختیار کر لی اور اس کو کامیاب بنانے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔تاہم انہوں نے اپنے سلسلۂ کتب ''شاہکار'' کی تجدید بھی کر دی اور اب اسے ''شاہکار بک فاؤنڈیشن'' کا نام دیا۔کراچی میں ان کی ایک اور اہم قلمی مصروفیات قومی اخبار 'نوائے وقت' کی ڈپٹی ایڈیٹری ہے۔قاسم محمود نے ہر دور میں کئی ادبی کام اپنے زیر دست رکھے۔ان میں ''اسلامی انسائیکلو پیڈیا''.....''اردو انسائیکلو پیڈیا''.....''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا'' وغیرہ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔انہوں نے ایک سائنس میگزین بھی جاری کیا اور ''علم القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کی پارہ وار تدوین و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۹۷ء میں قاسم محمود لاہور واپس آ گئے' جوہر ٹاؤن میں اپنے مکان کے ساتھ ایک مسجد بنائی،ایک کتب خانہ تعمیر کیا اور ''قرآن انسائیکلو پیڈیا'' اور ''احیائے اسلام انسائیکلو پیڈیا'' کی ترتیب و تدوین میں مصروف ہو گئے۔

۲۴ جنوری ۲۰۰۹ء کو اقبال اکادمی لاہور میں اہل ادب نے ان کے ساتھ ایک شام منائی اور ان کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کیا۔افسوس یہ بے مثل ادیب' مترجم' محقق ۲۰۱۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔لیکن ان کا علمی اثاثہ انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

سید قاسم محمود خود ناشر تھے ان کی چند کتابیں مقبول اکیڈمی نے بھی شائع کیں۔میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے بہترین دوستوں میں سے تھے اور کتابوں کے انتخاب اور اشاعت کے سلسلے میں مجھے ہمیشہ سودمند مشورے دیتے تھے۔بلاشبہ وہ بہت بڑے ادیب تھے۔رسالہ ''صادق''''صحیفہ'' اور ''ادب لطیف'' میں انہوں نے متعدد نئے لکھنے والوں کو قلم کا اعتماد عطا کیا اور انہیں نامور ادیب بنا دیا۔لیکن خود درویشی اختیار کی اور اہل جہاں سے کوئی مالی غرض وابستہ نہیں کی۔ان کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا کہ پاکستان میں علم کی روشنی پھیلے اور کتاب ہر آدمی کے ہاتھ میں نظر آئے۔اس مشن کی تکمیل کے لئے ہی انہوں نے شاہکار کتابوں کا سلسلہ شروع کیا اور اس کی فروخت اخبار کی طرح کی۔قاسم محمود کو اسلام اور پاکستان سے گہری محبت تھی،وہ قائداعظم کے

Marfat.com

شیدائی تھے، اسلام کا ہر نامور شخص ان کا ہیرو تھا لیکن وہ اس کے ساتھ ہی ایک کشادہ نظر انسان بھی تھے۔ وہ چاہتے تھے مغرب کے علوم نو کی کتابیں اور پورا کلاسیکی ادب اردو میں منتقل ہو جائے، چنانچہ انہوں نے ترجمہ نگاری خود شروع کی۔ مولانا حامد علی خان کو امریکی ادارے فرینکلن کا سربراہ مقرر کیا گیا تو اس ادارے کے لئے متعدد مشکل کتابیں ترجمہ کیں۔ قاسم محمود اپنے علم کی نمائش نہیں کرتے تھے لیکن یہ ان کی باتوں سے چھلک چھلک پڑتا تھا۔ وہ اردو کے واحد ادیب تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ادب کی خدمت میں صرف کیا اور آج ان کی لحد ان کے اعلیٰ کام کی وجہ سے روشن ہے۔

Marfat.com

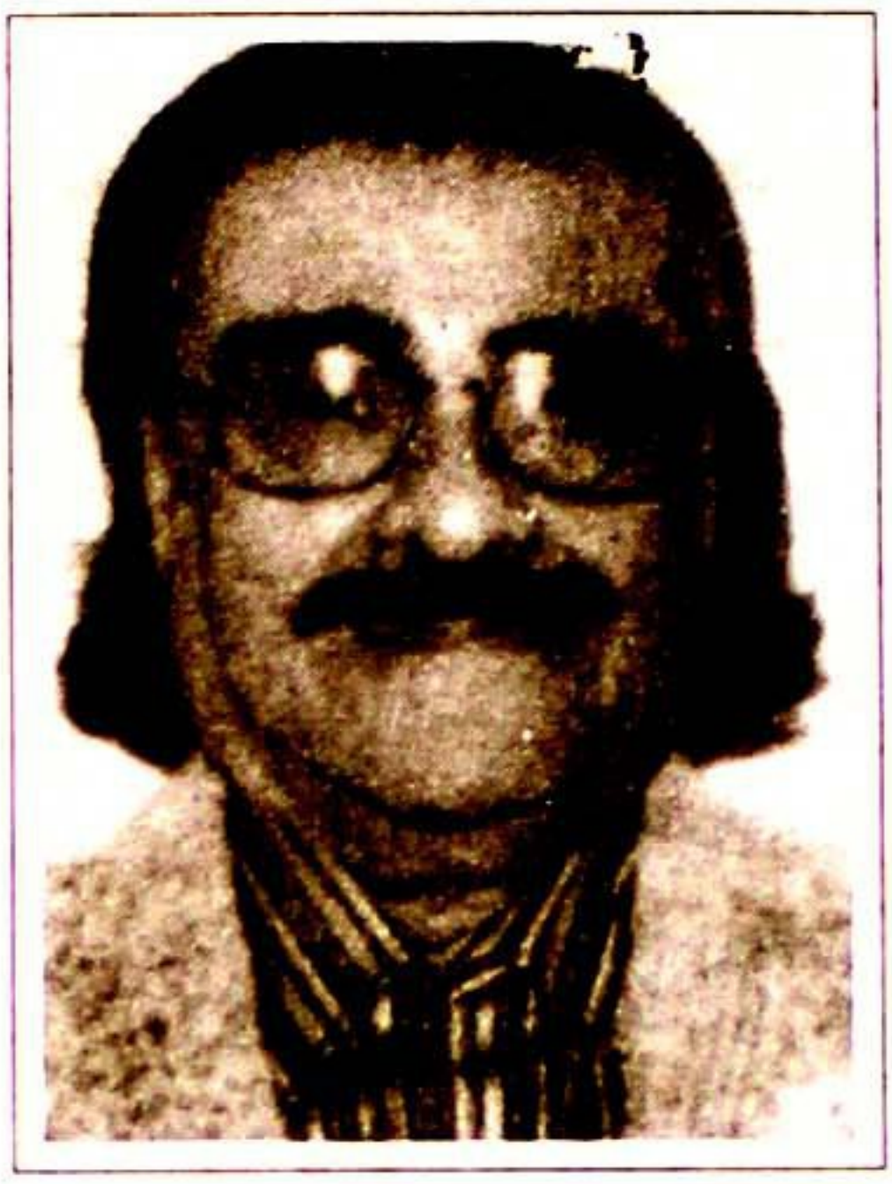

نقش بند قمر نقوی بھوپالی

ایک طویل عرصے تک قمر نقوی کے نام سے افسانے' سفرنامے' شکارنامے اور منظومات لکھنے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی انفرادیت کا کریڈٹ بہت سے دوسرے لوگ حاصل کررہے ہیں جو ''قمر نقوی'' ہی کہلاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قلمی نام کی ترکیب میں تبدیلی پیدا کر لی اور اپنی نسبی نسبت کو نام کا سابقہ بنالیا۔ اب وہ نقش بند قمر نقوی ہیں۔ لاہور ان کا دوسرا وطن ہے لیکن نام میں تبدیلی پیدا کی تو اپنا پہلا وطن اس کا لاحقہ بنالیا۔ اب وہ نقش بند قمر نقوی بھوپالی ہیں اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نام کا کوئی دوسرا شخص ہند و پاک میں موجود نہیں۔

نقش بند قمر نقوی بھوپالی جہانیاں جہاں گشت ہیں، ان کے پاؤں میں چکر ہے، اس لئے کہیں ٹک کر نہیں بیٹھتے اور دوسری بات یہ کہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔ بھوپال سے نکلے تو لاہور پہنچے۔ لاہور سے ایران گئے اور اب خیر سے امریکہ پہنچ گئے ہیں۔ ان اسفار کے دوران بندوق ان کے کندھے پر تھی۔ وہ جنگل نکل جاتے تو شیر' چیتے اور باگڑ بلے ڈر کر پناہ گاہیں تلاش کرنے لگتے لیکن نقش بند قمر نقوی بھوپالی کے نشانے سے بچ نہ سکتے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کی بنیادی حیثیت ایک شکاری کی ہے لیکن میں انہیں بنیادی طور پر ایک فطری ادیب سمجھتا ہوں جو گھر سے باہر

Marfat.com

قدم رکھتے ہیں تو ان کے مشاہدے کی حس بیدار ہو جاتی ہے اور وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اس کا تاثر ضائع نہیں ہونے دیتے۔ سیاحت کے دوران ان کی نظر صرف عجائبات پر جاتی ہے اور وہ اپنی تحریروں سے قارئین کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ خواتین کی طرح وہ اپنی عمر کسی کو نہیں بتاتے۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ بھی انہوں نے کہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے کہ کوئی تاریخ پیدائش پڑھ نہ لے۔ تعلیم کا ذکر آیا ہے تو یہ بتانا مناسب ہے کہ انہوں نے ادیب فاضل پنجاب یونیورسٹی سے کیا، تعلیم کی کچھ منازل گارڈن کالج راولپنڈی میں کیں اور ایم اے تاریخ میں کیا جس کی ڈگری انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے لی لیکن اس ڈگری پر قناعت نہیں کی۔ ایران گئے تو ایم بی اے کرنے کا شوق چرایا جس کی ڈگری تہران یونیورسٹی سے لی۔

نقش بند قمر نقوی بھوپالی کے جد امجد حضرت سید میراں محمد شاہ موج دریا نقوی بخاری ہیں جن کا مزار لاہور میں مرجع خاص و عام ہے۔ ان کے خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت میراں سید جلال الدین جہاں گشت نقوی بخاری ہیں، جن کا مزار مبارک اوچ شریف میں ہے۔ ان کا شجرۂ نسب امام علی نقویؒ سے ہوتا ہوا امیر المومنین سیدنا علیؓ بن ابی طالب اور سیدۃ النساء الجنۃ سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے وسیلے سے رسول اکرم خاتم الانبیاءؐ تک جا پہنچتا ہے۔ نقش بند قمر نقوی سالک راہِ حق ہیں۔ انہوں نے اپنے دل کو روشن کرنے کے لئے پہلے اپنے والد محترم بحر العلوم میراں حکیم سید عبدالعلی نقوی بخاری نقش بندی سے بیعت کی اور ان سے جو تربیت حاصل کی تھی اس کو اپنے عمل سے فروغ دیا۔ تشنگی محسوس کی تو بیعت کی تجدید حضرت عالی جناب پیر سید باقر علی شاہ نقوی بخاری نقش بندی کے دست حق پرست پر کی جو پیر صاحب کیلیاں والہ موسوم ہوتے ہیں۔

نقش بند قمر نقوی کی فطرت میں دین کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے لیکن وہ دنیاداری کے فرائض سے بھی کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ان کے ایک ہاتھ پر دین ہے تو دوسرے ہاتھ پر دنیا ہے اور انہوں نے دونوں سے وفاداری استوار کی اور عمل کا انحصار دیانتداری پر کیا۔ پیشہ وارانہ زندگی کی ابتدا ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں پروگرام اسسٹنٹ کی ملازمت سے کی۔ لاہور

Marfat.com

میں یو ایس ایڈ U.S.A.I.D میں افسر تعلیمات کی خدمات انجام دیں پھر پاکستان سے باہر جانے کی آرزو پیدا ہو گئی۔ان کی اگلی منزل ایران تھی جہاں آریہ مہر شاہ ایران حکمران تھا۔ قمر نقوی نے یہاں بارہ سال قیام کیا۔ایرانیوں نے ان کی مشاورت سے استفادہ کیا۔قلم اور قرطاس کا رشتہ انہوں نے ہر جگہ قائم رکھا۔سفر کرتے تو سفر نامہ ضرور لکھتے اور شکار پر جاتے تو شکاریات سے لوگوں کا دل بہلاتے۔ایران سے ابوظہبی چلے گئے جہاں حکومت کے سرکاری روزنامے ''امیرٹس نیوز'' میں خبر نویسی کرنے لگے۔صحرائی زندگی سے دل اکتایا تو کولمبس کی طرح نئی دنیا کی دریافت پر نکل کھڑے ہوئے اور امریکہ پہنچ گئے۔یہاں پاکستان' ایران' عرب امارات کے تجربات نے فائدہ پہنچایا اور کئی امریکی اخبارات کے نامہ نگار ہو گئے لیکن آخر کار عملی زندگی سے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ان کے جنون نے انہیں فارغ نہیں بیٹھنے دیا۔اب امریکہ کی سیریں کرتے ہیں اور کتابیں لکھتے ہیں۔

شکاریات پر ان کی کئی کتابیں مقبول اکیڈمی نے شائع کیں۔ناول اور ادبی و اسلامی کتب شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے سب پرچوں میں چھپتا ہے۔ہم نے ایک دفعہ بڑے ادب سے ان کی عمر کے بارے میں پوچھا۔ہنس کر بولے۔''ابھی تو میں جوان ہوں'' اور اپنی تازہ ترین تصویر دکھائی جس میں وہ جوان بلکہ نوجوان نظر آتے ہیں۔سر پر بالوں کا گنجان جنگل ہے۔مونچھیں تلوار کی دھار ہیں۔آنکھوں پر عینک ہے۔لیکن عینک کے شیشوں سے یہ سوال ابھر رہا ہے۔

''کون ہوتا ہے' حریف مئے مرد افگن عشق''

Marfat.com

مجیب الرحمٰن شامی

جناب مجیب الرحمٰن شامی اہل صحافت کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو استبداد و جبر کو نفرت کی نظر سے دیکھتے اور اس کے خلاف قلم کا احتجاج ضروری سمجھتے ہیں۔ آزاد پاکستان میں اردو صحافت سے وہ روح اڑ چکی تھی جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' میں محمد علی جوہر نے ''ہمدرد'' میں اور ظفر علی خان نے ''زمیندار'' میں پروان چڑھایا تھا۔ صحافت اب صنعت کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور صحافی ایسا قلم کار تھا جو آج کے تقاضوں کے مطابق قلم کی مشقت اٹھاتا تھا لیکن مجیب الرحمٰن شامی ایسے گروہ سے مختلف قسم کے صحافی تھے، انہوں نے ملک و قوم کے ساتھ دین کے تقاضوں کو بھی فوقیت دی اور اس نوزائیدہ ملک کی صحافت میں دینی اقدار اور اسلامی تعلیمات کے مطابق اخلاقیات کو فروغ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکمرانوں کو ان کے خیالات میں بغاوت کی بو محسوس ہوئی اور انہیں نظریاتی اختلاف پر قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی لیکن شامی صاحب کے مزاج میں لچک نہ آئی۔ وہ ٹوٹ سکتے تھے لیکن جھک نہیں سکتے تھے۔ اس روش پر وہ آج بھی قائم نظر آتے ہیں جبکہ وہ ایک ماہانہ اور ہفتہ وار جریدے کے علاوہ اب ایک کثیر الاشاعت قومی روزنامے ''پاکستان'' کے مدیر ہیں۔

Marfat.com

مجیب الرحمٰن شامی ۱۶ اگست ۱۹۴۵ء کو بھارت کے ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ آزادی کے بعد جب انتقال آبادی شروع ہوا تو ان کا خاندان پاکستان آ گیا۔ انہوں نے بی اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں حاصل کی اور قانون کی تعلیم کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کا مزاج صحافت کی طرف تھا۔ قانون کی تعلیم کے دوران ہی ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات پر تبصرے کرنے لگے جو کراچی کے اخبارات میں نمایاں طور پر چھاپے جاتے۔ شامی صاحب کے صحافتی مزاج میں ادب و شعر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کلاسیکی ادب کے مطالعے نے انہیں اپنا اسلوب وضع کرنے اور الجھی ہوئی سیاسی بات کو سلیقے سے پیش کرنے کا خاص کردار ادا کیا۔ چنانچہ ان کا جملہ دو دھاری ہوتا ہے۔ بظاہر اس میں مزاح موجود ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کا طنزیہ زاویہ قاری کی زیادہ توجہ کھینچتا ہے۔ مضمون کے دورانیے میں با موقعہ اور برمحل شعر کا استعمال ان کی تحریر کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔

مجیب الرحمٰن شامی نے اپنی تعلیم کے دوران ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سرکاری ملازمت نہیں کریں گے اور صحافت کے آزاد پیشے میں اپنی زندگی گزاریں گے۔ انہوں نے ۱۹۶۶ء میں صحافت کا آغاز روزنامہ ''حریت'' کراچی سے کیا اور ان کی نوکیلی تحریروں نے جلد ہی اہل صحافت کو ان کی طرف متوجہ کرا دیا۔ چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۷ء میں انہیں جنگ گروپ نے اپنے ہفت روزہ ''اخبار جہاں'' کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ بعد ازاں الطاف حسن قریشی نے لاہور سے ہفت روزہ ''زندگی'' نکالا تو شامی صاحب کو ''زندگی'' کی ادارت پیش کر دی کیونکہ وہ خود ''اردو ڈائجسٹ'' کی ادارت میں مصروف تھے اور ''زندگی'' کو مجیب الرحمٰن شامی جیسے دبنگ اور جرأت مند ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ہفت روزہ ''زندگی'' کو قومی مقاصد کا پاسبان بنانے اور مسائل پر تنقید کرنے والا جرأت مند پرچہ بنانے میں مجیب الرحمٰن کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ اس رسالے نے ایوب خان کے دور میں حزب اختلاف کا کردار ادا کیا اور ''نظریاتی جرنلزم'' کو اس

Marfat.com

انداز میں متعارف کرایا کہ سرکاری حلقے ان کے مخالف ہو گئے لیکن مجیب الرحمٰن شامی کے صحافتی مزاج کی ساخت میں حزیت پسندی، وطن دوستی، اسلام پسندی اور دینی رجحانات نے گھر بنالیا تھا۔ وہ پاکستان کو بھی ان تصورات کی روشنی میں فلاحی سلطنت دیکھنا چاہتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ نے ان کے قلب و ذہن کو زخمی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ان کے کڑے نقاد کی صورت میں ابھرے۔ اور بھٹو صاحب نے بھی ان کے خلاف جھوٹے مقدمات بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، انہیں گرفتار کر لیا گیا اور مارشل لاء عدالت نے انہیں ایک برس قید بامشقت کی سزا سنادی۔ یہاں مجیب الرحمٰن شامی کی قانون کی تعلیم کام آئی اور انہوں نے مارشل لاء کورٹ کی قانونی حیثیت کو چیلنج کر دیا۔ ان کا یہ تحریری بیان آزادیٔ صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب صورت یہ تھی کہ حکومت شامی صاحب کی آواز دبانے کے لئے ان کے رسالے کا ڈیکلریشن منسوخ کرتی، مطبوعہ کاپیاں ضبط کر لی جاتیں، انہیں دھمکیاں دی جاتیں لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور وہ مستعار ڈیکلریشن سے نیا پرچہ نکال کر اپنی جدوجہد جاری رکھتے۔ پاکستان کی اردو صحافت میں انہوں نے ظفر علی خان اور مولانا محمد علی جوہر کی مثال تازہ کر دی۔

اس دوران شامی صاحب نے روزنامہ ''نوائے وقت'' کے ادارتی صفحے پر ایک نیا کالم ''جلسۂ عام'' شروع کیا جس میں حکومت پر تلخ و تند لیکن مہذب لہجے میں تنقید کی جاتی تھی۔ اس کالم نے ملک میں زبردست پذیرائی حاصل کی، بعد میں یہ کالم روزنامہ ''جنگ'' میں چھپنے لگا اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب افغانستان میں روسی فوجوں کے خلاف جہاد شروع ہو گیا تو اس کالم نے میزائلوں کا کام کیا اور دائیں بازو کی قوتوں کو مضبوط نظریاتی اساس فراہم کی۔

شامی صاحب نے ۱۹۷۴ء میں اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ قائم کیا جس کے تحت ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' اور ہفت روزہ ''زندگی'' شائع ہونے لگے۔ ان دو پرچوں کو بھی شامی صاحب

Marfat.com

کے اداریوں کی وجہ سے پورے ملک میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور صدر پاکستان نے انہیں ۱۹۹۳ء میں ''تمغہ امتیاز'' پیش کیا جو اس سے پہلے شائد کسی صحافی کو پیش نہیں کیا گیا تھا۔شامی صاحب نے صحافت کا جو سفر روزنامہ ''حریت'' میں ۱۹۶۶ء میں شروع کیا تھا وہ مرور لیام کے ساتھ مسلسل مائل بہ ارتقاء رہا اور ۱۹۹۹ء میں وہ ملک کے بڑے قومی اخبار روزنامہ ''پاکستان'' کے چیف ایڈیٹر بن گئے۔یہ اخبار ملک کے پانچ بڑے شہروں سے شائع ہوتا ہے۔اس کی پالیسی کسی سیاسی جماعت کے تابع نہیں۔بلکہ اس کی کمٹمنٹ حسب سابق اسلام' پاکستان اور اعلیٰ تہذیبی اخلاقیات سے ہے۔شامی صاحب اس اخبار کی آزاد پالیسی کے نگران ہیں تاہم جب کبھی ملک میں کوئی بحرانی کیفیت سامنے آئے تو وہ اپنے دستخط سے اداریہ لکھتے ہیں اور سچی اور کھری آواز حکمرانوں اور حکومت کے ایوانوں میں پہنچا کر گونج پیدا کر دیتے ہیں۔شامی صاحب کو ملک کی ممتاز صحافتی تنظیموں کے ساتھ وابستگی کا شرف حاصل رہا ہے اور وہ سی پی این ای اور اے پی این ایس کے اہم عہدوں پر بھی فائز رہ چکے ہیں۔ان دنوں ان کی اہم ترین مصروفیات نجی ٹی وی چینلز ہیں جو سیاسی موضوعات پر ان کی رائے حاصل کرنے کے لئے ہمہ وقت مستعد اور منتظر رہتے ہیں۔

مجھے شامی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے متعدد مواقع ملتے رہے ہیں۔اچھی کتاب کا مطالعہ کرنا ان کی عادت ہے جسے اب عشق کا درجہ حاصل ہے۔انگریزی میں کوئی معیاری کتاب نظر سے گزرے تو اس کا پورا ترجمہ قومی ڈائجسٹ میں پیش کر دیتے ہیں۔صحافت کی دنیا میں آج ان کا ڈنکا بج رہا ہے لیکن فطری طور پر وہ بے حد منکسر مزاج انسان ہیں اور ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک سماجی رہنما میں پائی جاتی ہیں۔شامی صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے اور اس میں ہر طبقہ خیال کے لوگ شامل ہیں۔ان میں سے کچھ جب شامی صاحب کے ڈرائنگ روم یا ان کے دفتر میں حاضر ہوں تو تازہ ترین موضوعات پر بحث ونظر کا بازار گرم ہو جاتا

Marfat.com

ہے اور پھر وقت کی رفتار رک جاتی ہے۔صبح کے جانے اور شام کے آنے کا پتہ نہیں چلتا۔ان کی شخصیت کے اسی زاویئے سے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ شامی صاحب بنیادی طور پر مجلسی انسان ہیں۔ اور وہ جہاں بھی ہوں وہاں مجلس قائم ہو جاتی ہے' بحث ومناظرہ شروع ہو جاتا ہے۔جس کے کچھ آثار اگلے روز اخبار ''پاکستان'' میں بھی نظر آ جاتے ہیں۔میرے لئے ان کا وجود مایۂ افتخار ہے' کیوں کہ وہ مشکل وقت میں دوستوں کے کام آنے والے انسان ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں طویل زندگی دے اور ہمیشہ خوش رکھے۔(آمین)

Marfat.com

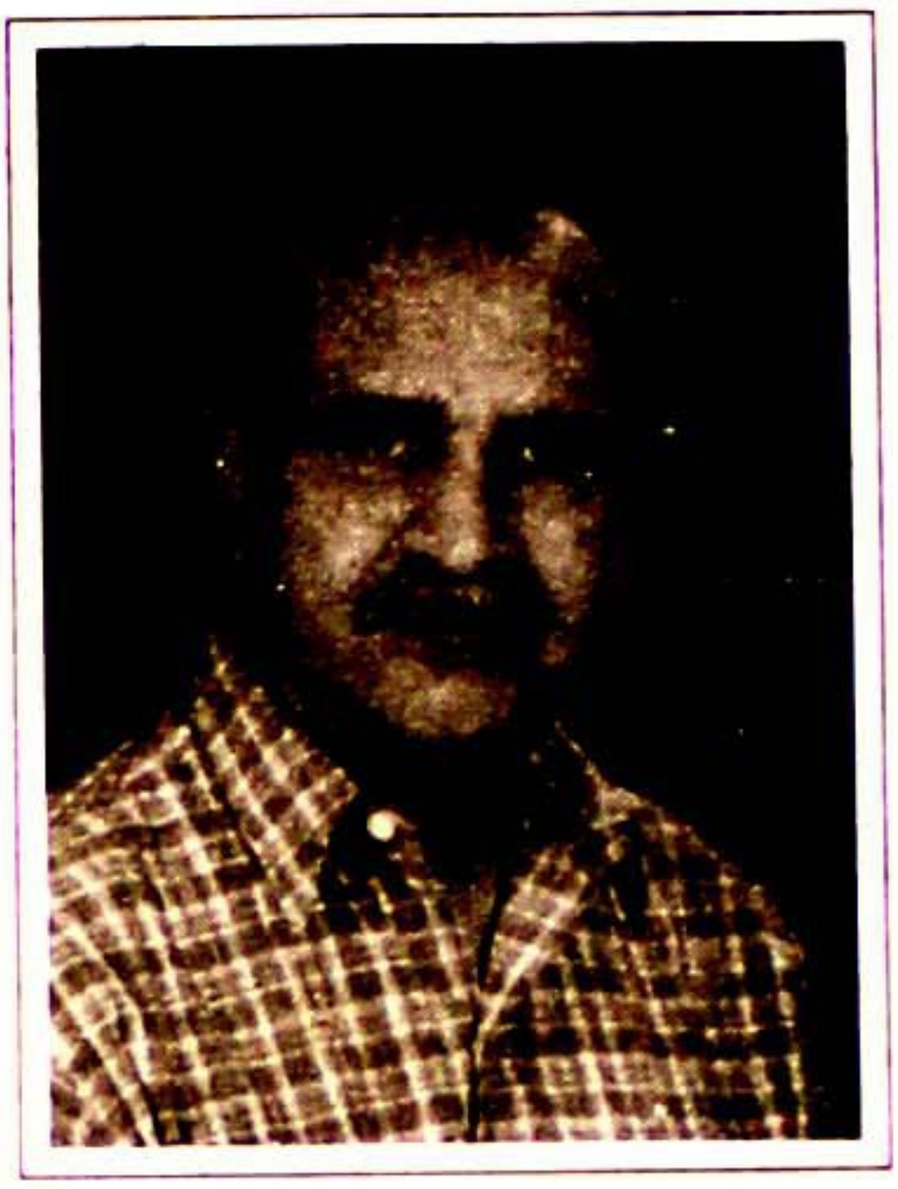

محمد آصف بھلی

محمد آصف بھلی صاحب کا پیشہ وکالت ہے اور وہ سیالکوٹ کے نامور قانون دانوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن ان کی پہلی محبت ''صحافت'' ہے' جس کے ساتھ انہوں نے قانون دانی کی مصروفیت میں بھی رشتہ استوار کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کسی اہم مقدمے کا بریف بھی تیار کر رہے ہوں تو ان کی داخلی آنکھ معاشرے کے مدوجزر کو دیکھ رہی ہوتی ہے اور جونہی ان کے خیال میں کوئی نکتہ ابھرتا ہے تو کالم لکھنے لگتے ہیں۔ ان کے کالم کا نام ''چوتھا ستون'' ہے جو صحافت کا معاشرتی استعارہ ہے۔ یہ کالم پہلے ''پاکستان'' میں چھپتا تھا۔ اب ''نوائے وقت'' میں شائع ہوتا ہے۔ محمد آصف بھلی کی معاشرتی خوبی یہ ہے کہ صحافت اور وکالت میں ہمیشہ دیانت فکر کو بروئے کار لاتے ہیں اور اپنی خودی کی خود حفاظت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک انہیں کوئی خرید نہیں سکا، نہ ان کی ذاتی رائے کو تبدیل کر سکا ہے بلکہ ملک کے حکمران اور قومی سیاستدان ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن آصف بھلی صاحب علامہ اقبالؒ کے ارشاد پر عمل کرتے ہیں۔

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

Marfat.com

آصف بھلی ۱۵اپریل ۱۹۵۵ء کو رسول پور بھلیاں ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا رجحان صحافت کی طرف تھا اوراس دور میں ہی ضلعی اخبارات کے علاوہ لاہور کے اخبارات میں بھی مقامی خبریں لکھنے لگے تھے۔یونیورسٹی میں آئے تو رسالہ ''محور'' اور ''المیزان'' کی ادارت کی۔آغا شورش کاشمیری کے رسالہ ''چٹان'' میں مضامین لکھے۔صحافت میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہیں چند دوستوں کے مقدمات میں ان کی معاونت کرنی پڑی تو انہوں نے باقاعدہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر ڈگری بھی حاصل کر لی۔اب صحافت ان کا عشق بن گیا اور وکالت نے پیشے کی صورت اختیار کر لی۔آصف بھلی صاحب نے دونوں محبے وفاداری بشرطِ استواری کا ثبوت دیا۔

آصف بھلی صاحب کی شخصیت آل راؤنڈر کی ہے۔ان کا مستقل قیام چونکہ سیالکوٹ میں ہے اس لئے وہ شہر اقبال کو پاکستان میں ہی نہیں دنیا کے نقشے پر بھی نمایاں رکھتے ہیں۔اس شہر میں کئی مشاعرے منعقد کرا چکے ہیں۔ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سیالکوٹ کے سیکرٹری اور صدر کی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

آصف بھلی اپنے کارناموں کو عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے کتابیں تصنیف کرتے رہتے ہیں۔ان کی مشہور کتابوں میں ''چوتھا ستون'' .....''جمہوریت سے ملاقات''.....''سیاست کے روبرو''.....''چوتھے ستون سے مکالمہ'' اور''سیاست دان'' شامل ہیں۔ان کی تالیفات میں ''سفر کے سو رنگ''..... ''صدی کی منتخب غزلیں''.....''اشعار کا دفتر کھلا''.....''میں نے شاعر کو دیکھا''.....''جب میرا انتخاب نکلے گا'' اور''غزلیات میر'' چھپ چکی ہیں۔

آصف بھلی صاحب سے میرا ذاتی تعلق یہ ہے کہ میرا گاؤں دیووال ان کے ہمسائے

Marfat.com

میں واقع ہے۔رسول پور بھلیاں کی حدیں جس طرح دیووال سے ملتی ہیں' اسی طرح میرا دل آصف بھلی سے ملا ہوا ہے۔ان کی دوستی میرا ذاتی افتخار ہے' میری طمانیت کی بات یہ ہے کہ آصف بھلی صاحب نے اپنے خلوص میں کبھی کمی نہیں آنے دی۔

مقبول اکیڈمی کی کئی کتابوں پر انہوں نے بڑے بامعنی اور ادبی نوعیت کے تبصرے کیے ہیں۔

Marfat.com

محمد منشا یاد

محمد منشا یاد اردو کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے تخلیق کار کے اس بنیادی فریضے کو اہمیت دی ہے کہ وہ وقت کا نباض ہوتا ہے اور معاشرے کے روگ کی نشاندہی واشگاف لفظوں میں کرتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے راجندر سنگھ بیدی کا مثیل قرار دیا' کچھ نے اسے کرشن چندر کے مزاج کا افسانہ نگار شمار کیا۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ منشاد یاد نے اپنی دیہاتی آگہی کو قائم رکھا۔ کڑوے سچ کا گھونٹ پیا اور کہانی کی صورت میں شہری معاشرے کی وہ صورت پیش کی جسے ایک دیہاتی اپنی بصیرت اور ظاہری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

منشا یاد ۵ ستمبر ۱۹۳۷ء کو موضع ٹھٹھہ نشتر ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوا۔ یہ مقام صوبہ پنجاب اور ضلع شیخوپورہ کے نقشے میں ایک نقطے کی صورت میں بھی نظر نہیں آتا لیکن اب اس لئے مشہور ہو گیا کہ اس گمنام موضع سے منشا یاد جیسا انسان دوست کہانی نگار پیدا ہوا تھا۔ سنا ہے کہ شیخوپورہ کے سکولوں میں طلباء کو یہ بات خاص طور پر بتائی جاتی ہے کہ منشا یاد اس علاقے کا افسانہ نگار ہے جو سارے پاکستان کے عوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ انہوں نے حافظ آباد ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۵ء میں پاس کیا اور اپنا مستقبل خود بنانے کے لئے ۱۹۵۵ء میں جی۔ ایس۔ ای

Marfat.com

رسول میں داخلہ لے لیا۔اس فنی ادارے سے منشا یاد نے ۱۹۵۷ء میں سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا۔

ایک بنیادی فنی امتحان پاس کر کے ادیب بننے والے منشا یاد پہلے محنت کش نہیں تھے۔اس سے پہلے مرزا ہادی رسوا نے جو امراؤ جان ادا کے شہرۂ آفاق ناول نگار ہیں رڑکی سے اوورسیئر کا امتحان پاس کیا تھا اور ادب میں شہرت حاصل کی تھی۔انور سدید بھی منشا یاد کے پیش رو ہیں جو جی۔ایس۔ای رسول سے ڈپلومہ حاصل کر کے محکمہ آبپاشی میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں لیکن اب ادب ان کی پہچان ہے۔منشا یاد نے اپنی تعلیمی استعداد کو اپنے شوق سے بڑھایا، پہلے ادیب فاضل کیا پھر بی اے کیا۔حشمت علی اسلامیہ کالج راولپنڈی میں داخلہ لے کر ۱۹۶۷ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، پانچ سال کے بعد ایم اے پنجابی کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے لی۔اس وقت ان کی خانہ آبادی کو سات برس ہو چکے تھے اور وہ دو تین بچوں کے والد بھی بن چکے تھے۔ملازمت کا آغاز محکمہ بحالیات کے انجینئرنگ کے شعبہ سے کیا لیکن ۱۹۶۰ء میں اسلام آباد کے ترقیاتی ادارہ میں سب انجینئر بن گئے۔انہوں نے محنت اور دیانت کی ایسی مثال قائم کی کہ انہیں پہلے اسسٹنٹ انجینئر اور پھر ایگزیکٹو انجینئر بنا دیا گیا۔۱۹۹۷ء میں ۶۰ برس کی مقررہ عمر پر ریٹائر ہوئے تو وہ سی۔ڈی۔اے میں افسر تعلقات عامہ کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ان کا عہدہ افسر اعلیٰ شکایات کا تھا جہاں وہ نو آباد اسلام آباد کے پریشان حال لوگوں کی شکایتیں سنتے اور ان کا ازالہ کر کے خلق خدا کی دعائیں سمیٹتے تھے۔

منشا یاد اسلام آباد آئے تو یہ شہر ترقی کی منزلیں سر کر رہا تھا۔یاد صاحب نے ایک طرف اسلام آباد میں سرکاری تعمیرات اور رفاہ عامہ کے کاموں کی تکمیل میں حصہ لیا تو دوسری طرف اس نو آباد شہر کو فنون لطیفہ میں ترقی کرنے کا رستہ بھی دکھایا۔اس وقت وہ افسانہ نگار کی حیثیت میں نمایاں ہو چکے تھے۔ان کے افسانے ''اوراق'' اور ''فنون'' جیسے رسائل میں چھپتے تھے۔منشا یاد نے اسلام آباد میں حلقۂ ارباب ذوق کی بنیاد رکھی اور اس پلیٹ فارم پر نئے اور پرانے ادیبوں کو ایک میز پر بیٹھ کر شائستہ انداز میں ادب پاروں پر بحث کرنے کی طرح ڈالی۔بعد میں انہوں نے لکھنے والوں

Marfat.com

کی انجمن ترتیب دی۔ ''بزم کتاب'' قائم کی اور افسانے کے فروغ کے لئے ''فکشن فورم'' بنایا۔ ان سب اداروں کی علمی و ادبی کارروائیوں کی رپورٹ اخبارات میں چھپواتے اور ادیبوں کی کارگزاریوں اور ادبی معاشرے کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں پر کالم لکھتے۔ ان کے کالم اخبار تعمیر' نوائے وقت' مشرق اور جنگ اسلام آباد میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔

اسلام آباد میں منشا یاد کی حیثیت وہی ہے جو فیصل آباد میں گھنٹہ گھر کی ہے۔ دارالحکومت کے تمام ادبی اداروں کی مشاورت میں منشا یاد شامل ہوتے ہیں۔ اکادمی ادبیات اور مقتدرہ قومی زبان اور نشریات کے ادارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ ادیبوں کا وفد ملک سے باہر جائے تو منشا یاد پاکستان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چین' انڈیا' برطانیہ' امریکہ کی ادبی مجالس میں شرکت کر چکے ہیں اور اب اپنی ویب سائٹ بھی بنا رکھی ہے۔ ای میل کے ساتھ ساری دنیا کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔

اس تمام تفصیل کو منشا یاد کی زندگی کا ضروری حصہ سمجھئے لیکن وہ سب سے زیادہ اہمیت اپنی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کو دیتے ہیں جو اوراق کے علاوہ فنون میں بھی نمایاں چھپتے تھے۔ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں منشا یاد کے فن کے قدردان تھے۔

ہندوستان سے انہوں نے شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ سے داد حاصل کی۔ وزیر آغا نے انہیں افسانہ ''درخت آدمی'' کے حوالے سے ایسا افسانہ نگار تسلیم کیا ہے جو زیرزمین ثقافتی آثار کو زمین پر موجود ثقافتی مظاہر سے ہم رشتہ دکھانے میں مہارت رکھتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے فرمایا کہ ''منشا یاد بڑ بولا نہیں ہے'' وہ اپنے ادب کی سرگوشی کو نشر کرنے کے لئے لاؤڈ سپیکر استعمال نہیں کرتا۔ بھارت کے معروف نقاد شمس الرحمان فاروقی کی رائے میں منشا یاد ہماری دنیا کے ہر پہلو ہماری زندگی کے ہر حادثے اور ہمارے تخلیل کے ہر تاریک یا روشن کونے کو اپنی گرفت میں لے آتا ہے''۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ان کے فن کو سراہا کہ وہ ''سچی کہانی'' جھوٹی کہانی اور افسانے میں فرق کرتا ہے۔ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ''تخلیقات'' کو میں نظریئے کی کھونٹی سے نہیں باندھتا'' لیکن اس کے زیادہ کردار گرے ہوئے مفلوک الحال بے توقیر لوگ ہی ہیں''۔

Marfat.com

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے چار اہم ادبی شخصیتوں کی ان آراء سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ منشا یاد کسی ایک ملک کا کہانی نگار نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کا افسانہ نگار ہے جو اپنے بچپن میں گھر میں آتے ہوئے مہمان سے یہ سوال کرتے کرتے کہ آپ کو کوئی کہانی یاد ہے۔اور پھر کہانیاں سنتے سنتے وہ خود ایک عظیم کہانی نگار بن گیا جس کے افسانوں کے مجموعے ''بند مٹھی میں جگنو''.....''ماس اور مٹی''.....''خلا اندر خلا''.....''وقت سمندر''..... ''درخت آدمی''.....''دور کی آواز''.....''تماشا''.....''خواجہ سرائے'' اردو میں ''روز وگدا پانی'' اور ''ٹاواں ٹاواں تارا'' پنجابی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ان کے افسانے دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ان کی کتابیں سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نصاب کی طرح پڑھی جاتی ہیں۔اردو ادب ان پر فخر کرتا ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر مسکین حجازی

مسکین حجازی صاحب سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب وہ اپنی پہلی کتاب ''آزمائش کی گھڑی'' کی اشاعت کے لئے ناشر کی تلاش میں تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں نوعمر طلباء اور طالبات کو صحافت کی تعلیم دیتے اور ان کے ذوق ادب کو سنوارتے ہیں۔ ''کمپنی کی حکومت'' کے مشہور مصنف باری علیگ سے ان کی قریبی رشتہ داری تھی یعنی باری صاحب ڈاکٹر مسکین علی حجازی کے والد نسبتی (سسر) تھے۔ گویا ان کا تعلق ایک علمی اور ادبی خاندان سے تھا۔ میں نے مقبول اکیڈمی میں ان کی پذیرائی ان کے شایان شان کی اور حرف مطلب اپنی زبان پر لاتے ہوئے عرض کیا:

''کاش! مقبول اکیڈمی کو آپ کی پہلی کتاب شائع کرنے کا شرف حاصل ہو جائے''۔ مسکین حجازی بولے ''ملک صاحب! آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں آج آپ سے یہ دریافت کرنے آیا تھا کہ کیا آپ میری پہلی کتاب اشاعت کے لئے قبول کر لیں گے''۔ اس وقت ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔ مسودہ ان کے بیگ میں تھا،

Marfat.com

نکالا اور مجھے دے دیا۔ میں نے اسی وقت کاتب کو بلا کر کتابت کے لئے اس کے حوالے کر دیا۔ اس کے بعد مسکین حجازی صاحب کے ساتھ ایسے تعلقات استوار ہوئے کہ ان کی وفات تک ان کے خلوص میں کمی نہ آئی۔ لیکن ایک بات واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ شعبۂ صحافت میں کسی طالب علم کے داخلے کی سفارش لے کر حاضر ہوتا تو مسکین حجازی صاحب سفارش کی بجائے میرٹ کو فوقیت دیتے۔ سابقہ قبول شدہ طلبا کی فہرست نکالتے، طالب علم سے نمبر پوچھتے، اگر میرٹ پر نمبروں کی تعداد موزوں ہوتی تو داخلے کا وعدہ کر لیتے، نہ ہوتی تو انکار نہ کرتے اور کہتے کہ میں ''ویٹنگ لسٹ میں انہیں بھی شامل کر لیتا ہوں''۔ اس اثبات میں عملی طور پر ان کے انکار کا امکان شامل ہوتا تھا۔

مسکین علی حجازی یکم جون ۱۹۳۷ء کو مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تو اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور تعلیم کے ابتدائی مراحل کامیابی سے طے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخل ہو گئے۔ پہلے ایم اے صحافت کیا، پھر تاریخ میں ماسٹر کی ڈگری لی۔ اس دوران انہیں مضمون نگاری کی چاٹ لگ چکی تھی۔ تعلیم کے دوران میں ہی شورش کاشمیری نے انہیں اپنے مشہور ہفتہ وار رسالے ''چٹان'' کا نائب مدیر بنا دیا اور لکھنے کی پوری آزادی دے دی۔ مسکین حجازی کا رجحان عملی صحافت کی طرف تھا، شورش کاشمیری کی مجالس میں روزانہ بیٹھتے اور سیاستدانوں سے ملتے۔ اسی دور میں انہوں نے اداریہ نویسی، شذرہ نگاری، حالات حاضرہ پر تبصرہ، اور شخصیت نگاری میں خوب مشق کی۔ روزنامہ ''آفاق'' لاہور اور روزنامہ ''کوہستان'' میں ان سے دیگر صحافتی امور کے علاوہ بہت سے فیچر بھی لکھوائے گئے۔ اسی طرح مسکین علی حجازی سماجی اور تہذیبی وقائع نگار کی حیثیت میں سامنے آ گئے اور شہرت نے ان کے قدم چومے لیکن یہ ان کی منزل نہیں تھی۔ ایم اے کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرار کی ایک اسامی پر فائز ہو گئے۔ اس شعبے کے ساتھ وہ قریباً ۳۴ برس

Marfat.com

وابستہ رہے اور ''پنجاب میں اردو صحافت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے جہاں ایک طرف طلبا اور طالبات کو صحافت کی تعلیم اور تجزیہ عطا کیا۔ وہاں یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں میں بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ شعبۂ صحافت میں صدر مقرر ہوئے، صحافت کا نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی کے رکن بنے، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کمیٹی میں بھی انہیں شامل کیا گیا۔ گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان نے بھی ان کی خدمات سے استفادہ کیا اور اپنا شعبۂ صحافت ان سے مرتب کرایا۔

انہوں نے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کئی طلبا کی معاونت اور نگرانی کی اور آج ان کے طلبا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریس کے فرائض ادا کرتے ہیں اور ڈاکٹر مسکین حجازی کو اپنی زندگی میں استاد الاساتذہ کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ریڈیو پر بھی مقالہ پڑھتے رہے اور پھر جب ٹیلی ویژن آیا تو مختلف اسٹیشنوں پر علمی اور ادبی مذاکرات میں حصہ لیا۔

ڈاکٹر مسکین علی حجازی نے اپنی زندگی میں تقریر کے ساتھ تحریر کا سلسلہ جاری رکھا اور ایک درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں فن ادارت، برصغیر میں مسلم صحافت کی مختصر تاریخ ..... پاکستان میں ابلاغیات، مکتوب نگاری ..... عالم اسلام کا اتحاد ..... ڈالر کے دیس میں اور مولانا ظفر علی خان کے نام تو میرے ذہن پر فوراً ابھر آتے ہیں۔ ان کا بہت سا علمی کام اخبارات اور رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ ان کے شاگردوں کو یہ تمام چیزیں مرتب کر کے چھاپ دینی چاہئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کی اعلیٰ علمی خدمات متعدد قومی ایوارڈز پیش کئے گئے جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یوں محسوس ہوا کہ یونیورسٹی کا شعبۂ ابلاغیات اپنے ایک راہنما استاد سے محروم ہو گیا ہے۔

Marfat.com

مسکین علی حجازی مرنجاں مرنج قسم کے انسان تھے۔ایک شگفتہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ہمہ وقت طاری رہتی۔ایک سچے پاکستانی کی حیثیت میں انہوں نے اقبال اور قائداعظم کے افکار اپنے شاگردوں کے دل میں اتارنے کی کوشش کی اور انہیں ایک مخلص پاکستانی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔مسکین حجازی طلبا کو تعلیم بھی دیتے تھے اور ان کی شخصیت سازی اور کردار سازی بھی کرتے تھے۔افسوس' اب آنکھیں ان کو دیکھ نہ سکیں گی۔وہ واقعی ایک آزاد مرد مسلمان تھے۔

Marfat.com

مقصود احمد چغتائی

مقصود احمد چغتائی سے میرا پہلا تعارف علامہ عبدالستار عاصم نے کرایا تھا، عاصم صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ گوہر نایاب کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں اور جب ''گوہر نایاب'' مل جائے تو اس کے حلقہ بگوش ہو جاتے ہیں اور اس کا تعارف اپنے دوستوں سے کراتے چلے جاتے ہیں۔ جناب مقصود احمد چغتائی کو بھی انہوں نے تلاش و جستجو کی اس مہم میں ہی دریافت کیا تھا اور پہلی بات یہ بتائی کہ انہوں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ محنت کرنے والے انسانوں میں وہ بے مثل ہیں اور ستائش و تحسین کی تمنا نہیں کرتے۔

مقصود احمد چغتائی نے گریجوایشن کرنے کے بعد بنک کی ملازمت کر لی تھی، لیکن تعلیم کی توسیع کا سلسلہ جاری رکھا اور ملازمت کے دوران ہی ایم اے انگلش کر لیا۔ اپنے شعبے میں بینکنگ کا ایک ڈپلومہ انسٹی ٹیوٹ آف بینکرز سے لیا اور ایک رہنما کتاب ''بینکنگ گائیڈ'' شائع کی۔ کمپیوٹر کی ایجاد کو فروغ حاصل ہوا تو انہوں نے اس ٹیکنیک میں دسترس حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا اور امریکہ کے ایک ادارے سے سرٹیفکیٹ آف کمپیوٹر ونڈوز حاصل کیا۔

مقصود احمد چغتائی ایک تجربہ کار ماہر بینکار ہیں، لیکن فطرت نے ان کے باطن میں

Marfat.com

ایک ادیب کی پرورش بھی کی ہے، جس کے جمالیاتی ذوق کو فطرت کے مناظر تسکین دیتے ہیں۔ وہ ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے سیر و سیاحت پر نکل جاتے ہیں۔ سیاحت کے سفر کی ابتدا انہوں نے اپنے ملک سے کی اور وطن عزیز کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ملکی سیاحت کی طبع آزمائی کے بعد غیر ممالک کی سیاحت کو نکلے تو چین، کینیڈا، ایران، ترکی، بلغاریہ، رومانیہ، ہنگری، فرانس، جرمنی، انگلینڈ، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، بیلجیم، ہالینڈ، سوئٹزرلینڈ، امریکہ، ابوظہبی اور مصر وغیرہ گھوم آئے۔ واپس آتے ہیں تو اپنے مشاہدات میں خلقِ خدا کو شامل کرنے کے لئے سفرنامہ لکھتے ہیں۔ گوہر مقصود (روڈ ٹو یورپ) ''جہاں گردی''، ''گرین کارڈ کے دیس میں'' ان کے مشہور سفرنامے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا نصب العین سیاحت کو فروغ دینا ہے، اس کے لئے انہوں نے کئی رہنما کتابیں لکھی ہیں ن میں ''امریکن ویزا حاصل کریں'' اور ''کینیڈین ویزا حاصل کریں'' بہت مقبول ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ:

> ''کرۂ ارض کی وسعتوں اور یہاں بسنے والے انسانوں کے بارے میں معلومات جمع کرنا ایک دلچسپ علمی کام ہے اور مقصود احمد چغتائی اس کام میں انتہائی حد تک مصروف رہتے ہیں''۔

چغتائی صاحب کی کتاب ''چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا'' اس کی روشن خیال ہے۔

بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے انہوں نے سکاؤٹ تحریک سے وابستگی اختیار کی اور اس تحریک کو پاکستان میں مقبول بنانے کی کوشش کی، ان کی اس خدمت کو پوری دُنیا میں سراہا گیا اور انہیں بے شمار ایوارڈز پیش کئے گئے۔ کہنے لگے کہ میں نے ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلتے ہوئے محسوس کیا کہ ہماری قوم فتح کے نشے سے تو سرشار ہو جاتی ہے، لیکن اگر شکست کا سامنا کرنا پڑے تو اس کا حوصلہ قائم نہیں رہتا۔ ان کی نظر میں زندگی میں ناکامی ہی فتح کی راہ ہموار کرتی ہے۔ بوائے سکاؤٹ کی تحریک اس جذبے کو بڑی خوبی سے لوگوں کے ذہن نشین کر رہی ہے اور ان میں برداشت کے مادے کو فروغ دے رہی ہے۔

Marfat.com

ایک دفعہ علامہ عبدالستار عاصم مجھے چغتائی صاحب کے دفتر میں لے گئے۔ میں حیران رہ گیا کہ کمرے کی سب دیواریں تمغوں سے سجی ہوئی تھیں..... کارنس پر شیلڈیں رکھی ہوئی تھیں۔ تصویروں میں چغتائی صاحب اس عہد کے بڑے لوگوں سے مل رہے تھے..... میرے دل سے دُعا نکلی کہ اللہ ان کو صحت مند زندگی دے۔ ایسے لوگوں نے ہی پاکستان کے مستقبل کو تابناک بنانا ہے۔

Marfat.com

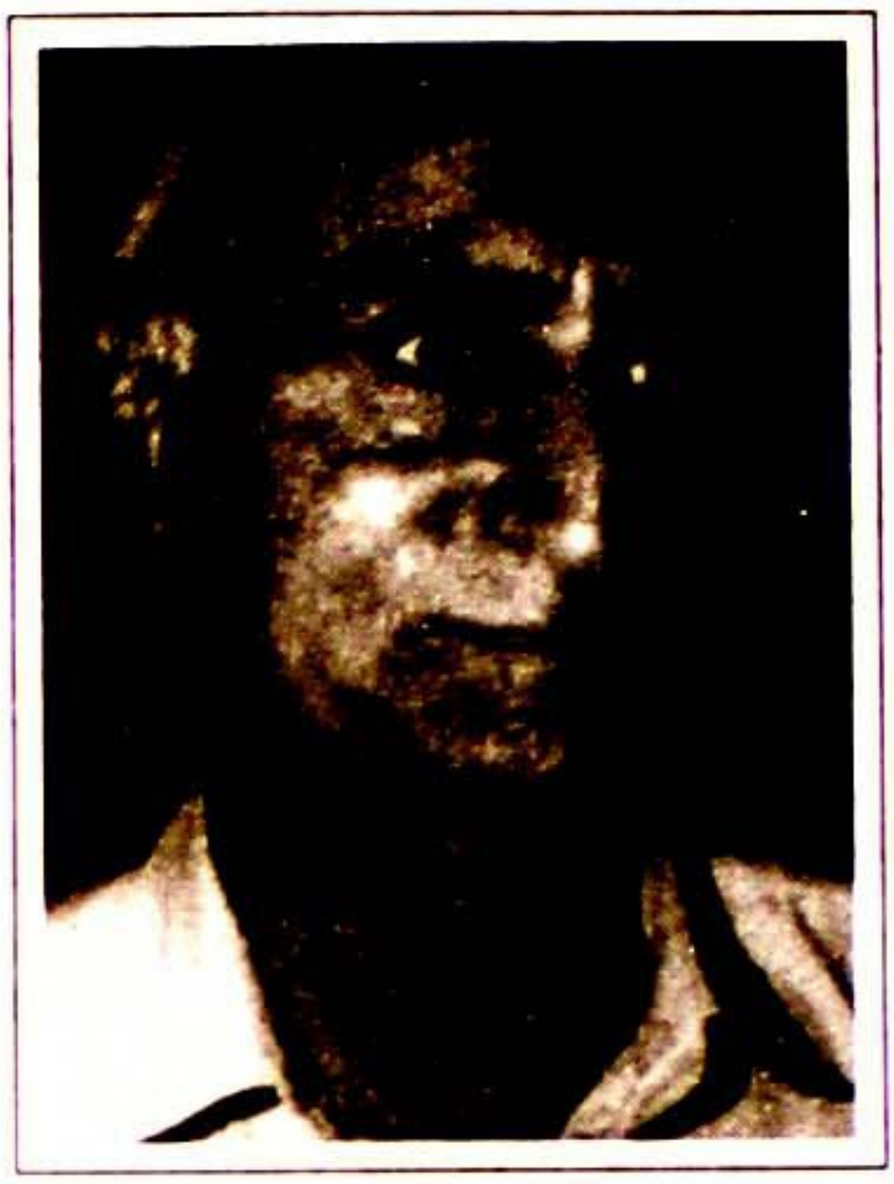

میرزاادیب

میرزاادیب اردو کے وہ خوش قسمت ادیب ہیں جن کو صحرا نورد کا پہلا خط چھپنے پر ہی شہرت مل گئی تھی، یہ افسانہ رسالہ ''ادبِ لطیف'' کے ایک سالنامے میں چھپا تھا۔اس وقت ادب کی فضا پر سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، مجنوں گورکھ پوری، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، حجاب امتیاز علی اور حامد اللہ افسر چھائے ہوئے تھے۔لیکن صحرا نورد کے خط نے افسانے کی رومانوی فضا کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔اور پھر ''صحرا نورد کے خطوط'' کتاب کی صورت میں سامنے آئے تو میرزاادیب کو ادب میں مستحکم حیثیت مل چکی تھی۔جس کسی نے یہ کتاب پڑھی تو وہ مصنف کو ایک ماورائی مخلوق خیال کرنے لگا اور خود میری خواہش پیدا ہوئی کہ کاش! میرزا صاحب میرے رسالہ ''چودھویں صدی'' میں ایسا ہی ایک خط لکھ دیں۔وہ لاہور میں رہتے تھے۔ان کو دیکھنے، ملنے اور پھر ''چودھویں صدی'' میں افسانہ لکھنے کے لئے انہیں دعوت دینے کی خواہش دل میں پیدا ہوگئی، لیکن میرا رسالہ ''چودھویں صدی'' چار دن کی چاندنی دکھا کر ادب کے اُفق سے غائب ہو گیا لیکن میں میرزا صاحب سے مل نہ سکا۔میں نے اپنا اشاعتی ادارہ قائم کیا تو میرزا صاحب کی کوئی کتاب چھاپنے کی آرزو میرے دل میں پھر مچلنے لگی۔اب اتفاق دیکھئے کہ میرا بیٹا ظفر مقبول میڈیکل کالج میں پہنچا تو

Marfat.com

اس کے ایک دوست تحسین میرزا ایک دن گھر پر تشریف لائے۔ظفر نے تعارف کرایا کہ تحسین صاحب اردو کے مشہور افسانہ نگار میرزا ادیب کے صاحبزادے ہیں۔میں نے انہیں گلے سے لگایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرزا ادیب سے مل رہا ہوں اور پھر ان سے ملنے کی خواہش کا ذکر بھی تحسین سے کئے بغیر نہ رہ سکا۔میرا خیال ہے کہ تحسین صاحب نے میرے اشتیاق کا ذکر اپنے والد صاحب سے ضرور کیا ہوگا۔چنانچہ اگلے دن ایک سادہ سا آدمی میری دکان میں داخل ہوا تو میں نے انہیں کتاب کا خریدار سمجھا۔میں نے انہیں سامنے کرسی پر تشریف رکھنے کے لئے کہا تو وہ بولے:

''میں تحسین کا والد ہوں جو آپ کے صاحبزادے ظفر کا کلاس فیلو ہے''!

میں یہ جملہ سن کر اچھل پڑا۔

''آپ میرزا ادیب ہیں''۔

میرزا صاحب نے کہا ''جی ہاں''.....

اب میں کبھی ان کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی سامنے شیلف میں لگی ہوئی کتابوں میں ''صحرا نورد کے خطوط'' اور ''صحرا نورد کے رومان'' کو دیکھتا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں سوچ میں پڑ گیا کہ ''صحرا نورد کے خطوط'' جیسی عظیم کتاب کیا واقعی اس شخص نے ہی لکھی ہے؟

اس پہلی ملاقات میں میرزا ادیب مجھے اگلے وقتوں کی شرافت کا نمونہ نظر آئے' وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھے انہوں نے میری طرف کم دیکھا' کم باتیں کیں' بس کتابوں کو اشتیاق کی نظروں سے دیکھتے رہے اور ایک جملہ بار بار دہراتے۔

''آپ کتابیں بڑی خوبصورت چھاپتے ہیں''۔

اس جملے نے مجھے حوصلہ دیا اور میں نے اپنی درخواست ان کے سامنے پیش کر دی۔

''میرزا صاحب کبھی ہمیں بھی اپنی کتاب چھاپنے کا موقعہ دیجئے''۔

میرزا صاحب یہ بات سن کر کھل اٹھے۔بولے ''کیوں نہیں۔کیوں نہیں۔آپ کے

Marfat.com

ادارے سے میری کتاب چھپے گی تو مجھے خوشی ہوگی''۔

میرزا ادیب سے تعلق کی یہ ابتدا تھی۔ان دنوں میرزا ادیب ریڈیو پاکستان کے سٹاف آرٹسٹ تھے اور موہنی روڈ پر واقع اپنے گھر سے پیدل ریڈیو اسٹیشن جاتے تھے۔

مقبول اکیڈمی ان کے راستے میں پڑتی تھی۔چنانچہ میرزا صاحب آتے جاتے ایک دفعہ ضرور رُکتے۔اپنی کتابوں کی طباعت واشاعت کے بارے میں دریافت کرتے اور دوسرے مصنفین کی چھپی ہوئی کتابوں پر تنقیدی نظر ڈالتے۔اردو ادب کی اس قد آور شخصیت کے انکسار سے میں بہت متاثر ہوتا۔کئی دفعہ دیکھتا کہ میرزا صاحب نئی کتاب دیکھنے میں اتنے محو ہو جاتے کہ چائے ٹھنڈی ہو جاتی، میں دوبارہ گرم چائے لانے کے لئے کہتا تو وہ انکار کر دیتے اور دوسری کتاب کی ورق گردانی کرنے لگتے حالانکہ میں اپنے ادارے میں چھپنے والی ہر کتاب انہیں ہمیشہ ادب واحترام سے پیش کر دیتا تھا۔

میرزا ادیب اردو دنیا کے مقبول ترین مصنف تھے اور آج یہ لکھتے ہوئے مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ادارے نے ان کی سب سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔ان کی ایک مختصر سی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

صحرا نورد کے خطوط (نیا ایڈیشن) صحرا نورد کے رومان (نیا ایڈیشن) صحرا نورد کا آخری خط ..... میرزا صاحب کی خودنوشت سوانح عمری ''مٹی کا دیا'' ..... ڈراموں اور افسانوں کی کتابیں ..... ''لہو اور قالین'' ..... ''آنسو اور ستارے'' ..... ''ستون'' ..... ''فصیل شب'' ..... ''شہر سے دور'' ..... ''شیشے کی دیوار'' ..... ''پسِ پردہ'' ''اجالوں کی گود میں'' اور ''خاک نشین'' وغیرہ۔

بچوں کے لئے ان کی کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہاں نام بھی گنوائے نہیں جا سکتے۔تاہم چند نام یہ ہیں۔

''شیروں کا بادشاہ'' ..... ''گڑیا'' ..... ''وطن کی پکار'' ..... ''کہانی ایک

Marfat.com

رات کی''.....''چالاک ہرن''.....''نانی اماں کی عینک''.....''بچوں کی عدالت''.....''قوم کی بیٹی''.....''ماموں جان اور ماموں جان''.....''باپ کی خدمت''.....''پہاڑ کی چوٹی پر''.....''کشمیر کا مجاہد''.....''اے وطن میرے وطن''.....''جن ماسٹر''.....''بگی کی گڑیا'' وغیرہ۔

میرزاادیب ہمارے ادارے میں تقریباً ہر روز آتے تھے اور دیر تک بیٹھتے تھے۔ بعض اوقات تو یہ بھی کہتے کہ یہ میرا دوسرا گھر ہے، لیکن وہ اپنے بارے میں بہت کم باتیں کرتے تھے۔ ان کی آپ بیتی ''مٹی کا دیا'' چھپی تو ان کے بارے میں مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ انہوں نے ''صحرا نورد کے خطوط'' اس وقت لکھی تھی جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ آئے دن انگریزی حکومت کے خلاف جلوس نکلتے اور جلسے ہوتے تھے۔ اسی دور میں سید سجاد ظہیر نے لندن سے واپس آ کر ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی جسے پنجاب میں فیض احمد فیض صاحب فروغ دے رہے تھے۔ اس تحریک کی نمائندگی رسالہ ''ادبِ لطیف'' کرتا تھا جس کے ایڈیٹر میرزاادیب تھے۔ اس دور کے دوسرے ادیبوں کی طرح میرزاادیب کی تخلیقات میں بھی وطن پرستی اور انسان دوستی کا جذبہ نمایاں تھا۔ انہوں نے ایسے کردار تخلیق کئے جو بدی کی مخالفت کرتے تھے اور معاشرے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کے علمبردار تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسان کی بنیادی نیکی کو ابھارا اور جدوجہد کے جذبے کو فوقیت دی۔ میرزا صاحب کی آپ بیتی سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ ان کے والد بہت سخت گیر تھے۔ گھریلو ماحول خوشگوار نہیں تھا۔ باپ کے جابرانہ رویئے سے بچنے کیلئے ہی میرزاادیب گھر سے نکل جاتے اور شاہی قلعے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر کہانیاں لکھتے رہتے۔ انہوں نے ابتدا میں شاعری بھی کی۔ ان کی نظمیں ظفر علی خان کے اخبار ''زمیندار'' کے سرورق پر چھپتی تھیں۔ اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا تو ان کے ہم جماعتوں میں بہت سے طلبا ادیب تھے۔ میرزا صاحب کی تحریریں رسالہ ''کریسنٹ'' میں چھپتی تھیں، تاہم انہیں شہرت اس وقت ملی جب وہ ''ادبِ لطیف'' کی ادارت کرنے لگے اور ''صحرا نورد

Marfat.com

کے خطوط'' لکھنے لگے تھے۔

میں یہاں میرزا ادیب کی اس خوبی کا اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے انگریزی حکومت میں کبھی نوکری نہیں کی۔ ریڈیو کے ساتھ وابستگی اختیار کی تو وہ سٹاف آرٹسٹ کے مقام سے بلند نہ ہوئے اور اپنی مرضی اور آزادی سے تخلیقی کام کیا۔ پاکستان ریڈیو نے جب ان کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر فارغ کر دیا تو میرزا صاحب نے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں کالم نگاری شروع کر دی۔ ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ لیکن وہ ہمیشہ ادب کے دائرے میں رہ کر بات کرتے تھے۔ مقبول اکیڈمی کی کتابوں پر سرسری تبصرہ لکھنے کی بجائے وہ پورا کالم لکھتے تھے اور مصنف کے خیالات و افکار اس طرح پیش کرتے کہ اسی روز زیرِ تبصرہ کتاب کے کئی خریدار اُمڈ آتے۔ میں فخر کر سکتا ہوں کہ میرزا ادیب نے سب سے زیادہ تبصرے ہمارے ادارے کی کتابوں پر لکھے اور ان کے تبصرے محض تعریفی نہیں ہوتے تھے بلکہ یہ ان کے تجزیاتی مقالات شمار کئے جا سکتے ہیں۔

میں میرزا ادیب کو فرزندِ لاہور شمار کرتا ہوں۔ ان کی ساری زندگی لاہور میں گزری اور یہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ ان کی برسی پر ڈاکٹر انور سدید نے روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ایک طویل مضمون لکھا جس میں انہوں نے میرزا صاحب کے مقبول اکیڈمی سے پرخلوص تعلق کا ذکر بالخصوص کیا ہے۔ اس مضمون کا ایک منظر حسب ذیل ہے؟

> ''انارکلی کے راستے میں وہ (میرزا ادیب) مقبول اکیڈمی پر رک جاتے ہیں۔ ملک مقبول احمد انہیں ''صحرا نورد'' کے خطوط'' کا گولڈن جوبلی ایڈیشن اور ان کی سوانح عمری ''مٹی کا دیا'' پیش کر رہے ہیں۔ میرزا صاحب کی آنکھوں میں طمانیت کی لازوال چمک ابھرتی نظر آ رہی ہے۔ اُٹھ کر گھر جانے لگتے ہیں تو ملک مقبول احمد انہیں روک لیتے ہیں' کہتے ہیں!

Marfat.com

''پروفیسر رشید امجد نے آپ کے فکر وفن پر ایک جامع کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کتاب آج ہی چھپ کر آئی ہے''۔

میرزا ادیب نے کتاب دونوں ہاتھوں میں تھام رکھی ہے۔ وہ اس کتاب کو استعجاب سے دیکھتے ہیں پھر ان کی مطمئن نظریں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور وہ بے اختیار ہو کر ملک مقبول احمد سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

''میری ادبی زندگی کا یہ سب سے بڑا ایوارڈ ہے''۔

اس وقت ''مٹی کے دیئے'' کی لو بلند ہو رہی تھی۔ اس کی شعاعیں تو آسمانی سفر کر رہی تھیں۔ زمین کا سورج ہفت افلاک کو منور کر رہا تھا۔ بلاشبہ یہ سعادت بزورِ بازو نہیں بلکہ خدائے بخشندہ کی عطا تھی۔ بلاشبہ ''مٹی کے دیئے'' کی لو روشن تھی''۔

میرزا ادیب اپنی زندگی میں اپنی کتابوں کے تمام حقوقِ اشاعت مقبول اکیڈمی کو تفویض کر گئے تھے اور یہ کتابیں باقاعدگی سے چھپ رہی ہیں۔ میرزا ادیب اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن میرے دل میں وہ زندہ ہیں۔ پاکستان کے لوگ انہیں ان کی کتابوں میں بھی زندہ محسوس کرتے ہیں۔

Marfat.com

ناصر نقوی

ناصر نقوی بنیادی طور پر سیاستدان ہیں لیکن وہ سیاست کے پیشے میں نہیں آئے اور اس کے برعکس صحافت کو اپنی زندگی کا وسیلہ بنایا جو سیاستدانوں کی بدعنوانیوں اور عوام دشمن حرکات کو بے نقاب کرتی ہے جب دیال سنگھ کالج میں پڑھتے تھے تو سٹوڈنٹس یونین کا انتخاب ان کے لئے چیلنج بن گیا۔ ناصر نقوی کا مشاہدہ تھا کہ کالج کی تعلیمی فضا کو سیاسی جماعتوں نے مسموم کر دیا تھا اور وہ طلباء کی انجمن کے ذریعے کالج کے امور میں دراندازی اور طلبا کی تربیت میں رخنہ انگیزی کر رہے تھے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آزاد امیدوار کی حیثیت میں یونین کے انتخابات میں حصہ لیں گے اور اپنی مقبولیت کے بل بوتے پر سیاست کا سہارا لینے والے امیدواروں کو شکست دیں گے۔ کہتے ہیں کہ ناصر نقوی کو انتخاب سے دستبردار ہو جانے کے لئے بھاری بھر کم پیشکشیں کی گئیں لیکن انہوں نے کسی سیاستدان کا چمچہ بننے سے انکار کر دیا اور جب انتخاب کا نتیجہ سامنے آیا تو ناصر نقوی نے سب کو پچھاڑ دیا تھا۔ تاہم یہ بات نظر انداز نہ کی جائے کہ ناصر نقوی نے طلبا کے امور کی پوری نگرانی کی لیکن اپنی تعلیم کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ کچھ لوگوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ناصر نقوی اگر سیاست کا شوق جاری رکھتے تو وزارت اطلاعات کا قلمدان ان کے پاس ہوتا لیکن انہوں نے

Marfat.com

صحافت کے آزاد پیشے کو ترجیح دی۔ حق وصداقت کا پرچم عوام کے لئے ہی نہیں صحافیوں کے لئے بھی بلند کیا۔ پریس کلب میں ان کے نام کا ڈنکا ہر دور میں بجتا رہا۔ پانچویں ویج بورڈ ایوارڈ ان کی مساعی سے ہی منظور ہوا تھا۔

ناصر نقوی کا خاندانی نام ساجد علی نقوی ہے۔ جوان کے والد کے نام واجد علی نقوی کا ہم قافیہ ہے۔ وہ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور بی اے کرنے سے پہلے ہی اس دور کے مشہور اخبار ''مشرق'' کے چیف اقبال زبیری نے انہیں ملازمت پر فائز کر دیا۔ بی اے کا نتیجہ نکلنے تک وہ اتنا عملی تجربہ حاصل کر چکے تھے کہ انہیں مزید تعلیم حاصل کرنا ضروری نہ سمجھا۔

اب وہ کتابیں پڑھنے کی بجائے انسانوں کو پڑھنے لگے تھے۔ معاشرے کے اندر تک گھس جاتے اور ایسی سچی خبر تلاش کر کے لاتے جس تک عام صحافی کی دسترس نہیں ہوتی تھی۔ ناصر نقوی کو اس دور میں ''مشرق'' اخبار کے ملازمین کے حقوق کے تحفظ کا خیال آ گیا اور اس خیال نے ان کے سامنے پھر ''مشرق ایمپلائز یونین'' کے انتخابات کا میدان پیش کر دیا۔ ناصر نقوی نے یہ چیلنج قبول کر لیا اور اس یونین کے چار مرتبہ صدر منتخب ہوئے۔ چاروں مرتبہ انہوں نے بھاری اکثریت حاصل کی۔ ان کی اس خدمت کو اب تک یاد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات پاکستان ٹائمز' امروز' مشرق اور مارننگ نیوز میں بحران پیدا ہو گیا تو جائنٹ ایکشن کمیٹی این بی آئی کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت میں ملازمین کو ''گولڈن شیک ہینڈ'' کی صورت میں لاکھوں روپے کے واجبات دلائے۔

کبھی کبھی وہ اس فخر کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ایک نوعمر صحافی کی حیثیت میں انہوں نے ''مشرق'' کے قد آور صحافیوں مثلاً عالی رضوی' عبدالکریم عابد' ریاض بٹالوی' خالد محمود' نذیر حق' اور نسیم ہاشمی کے ساتھ کام کیا۔ ان کی رائے میں ان میں سے ہر صحافی اپنی ذات میں انجمن تھا ہمارے سامنے ہر ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ لوگ نوجوان صحافیوں کو عملی صحافت کی تربیت دینے میں عار نہیں سمجھتے تھے۔ لاہور میں پریس کلب کی عالی شان عمارت ناصر نقوی کے دور میں ہی تعمیر

Marfat.com

ہوئی اور وہ ''بانی صدر'' معروف ہوئے۔

ناصر نقوی کی شخصیت کا ایک اور پہلو ان کے ٹی وی ڈراموں کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ پاکستان میں پہلا پرائیویٹ ٹی وی چینل ''این ٹی ایم'' کے نام سے نمودار ہوا تھا۔ ناصر نقوی نے اس کے لئے پہلا کمرشل اور پروفیشنل ڈرامہ سیریل ''پھندا'' لکھا اور اسے سلیم چشتی اور مسعود اختر جیسے نامور اداکاروں کے ساتھ پروڈیوس کیا۔ ان کے ڈرامہ سیریلز ''سفر'' ''اینی ٹائم'' اور ''کانٹے'' بہت مقبول ہوئے۔ پی ٹی وی کے ڈرامہ فیسٹیول میں ان کے ڈراموں ''اقرار'' ''عمر بھر کے لئے کافی'' اور ''اماوس'' کو منتخب کیا گیا۔ ناصر نقوی ان دنوں ''اے ٹی وی'' کے بیورو چیف کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کی اداکاری اور ڈرامہ نگاری ناصر نقوی کی شخصیت کے اضافی زاویئے ہیں۔ ان کی بنیادی حیثیت ایک اعلیٰ پائے کے صحافی اور ادیب کی ہے اور انہوں نے اس کام کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ مقبول اکیڈمی کے ساتھ ناصر نقوی کا تعلق ایک مصنف ہی کا تھا۔ لیکن ان کی شخصیت اتنی نرم خو اور جاذب نظر تھی کہ وہ اس اکیڈمی کے مصنفین کے وسیع تر حلقے میں شامل ہو گئے بلکہ میرے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ ان کا مزاج غیر کاروباری ہے۔ انہیں جو خوشی کتاب لکھنے میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ خوشی انہیں کتاب کے چھپنے میں ہوتی ہے اور وہ اپنے دوستوں کو اکثر بتاتے ہیں کہ ان کی زیادہ کتابیں مقبول اکیڈمی نے شائع کی ہیں اور یہ افتخار مقبول اکیڈمی کو حاصل ہے کہ پاکستان کا ایک نامور صحافی اس ادارے کے ساتھ وابستہ اور میرا برادر عزیز ہے۔

Marfat.com

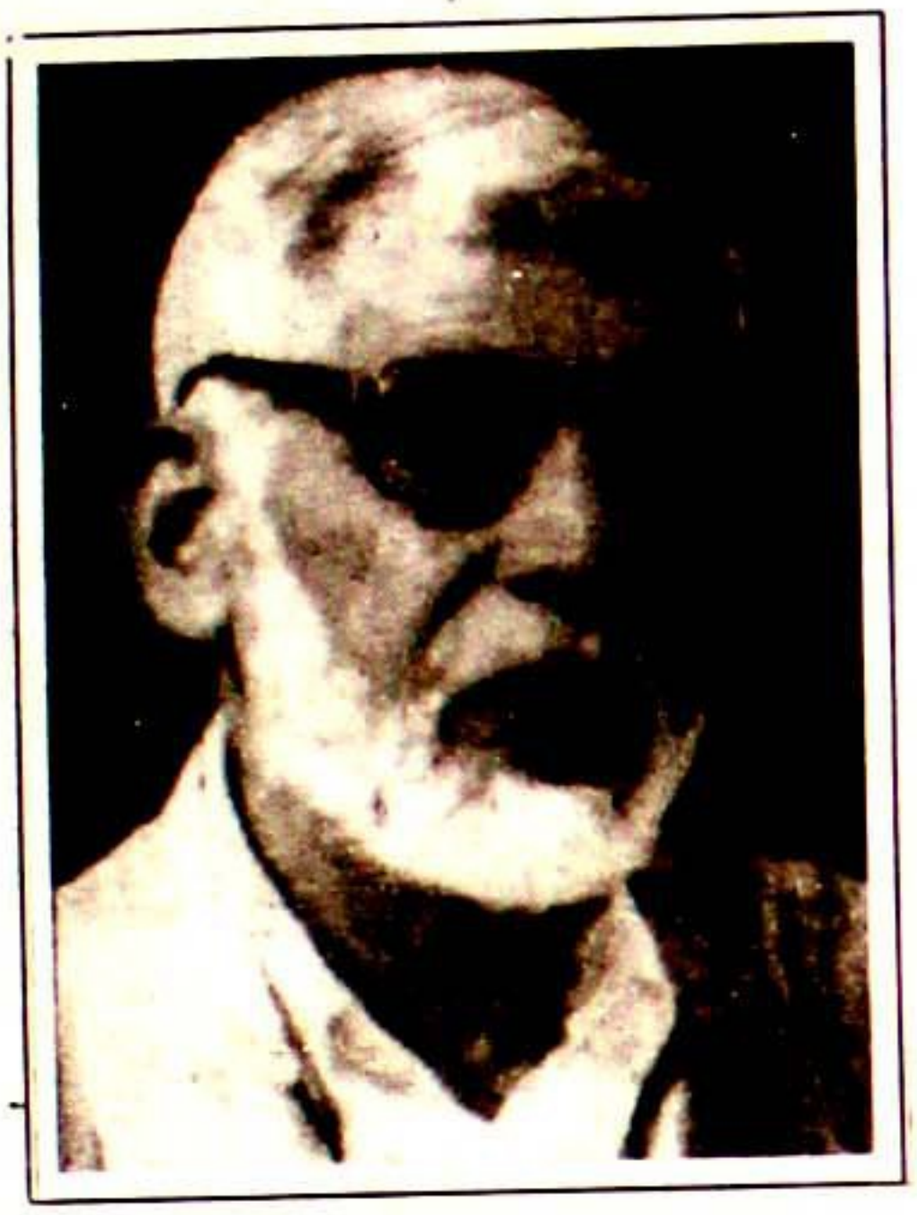

پروفیسر نذیر احمد تشنہ

پروفیسر نذیر احمد تشنہ بنیادی طور پر تاریخ دان ہیں لیکن زندگی کے تمام اہم موضوعات کو وہ اہمیت دیتے ہیں اور ان موضوعات پر اپنے مطالعے کو "اپ ٹو ڈیٹ" رکھنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے علم کی دولت کو تقسیم کرنے اور نئی نسل کو علوم نو کی معلومات سے سرفراز کرنے میں ہمیشہ دلچسپی لی اور ایسی کتابیں لکھیں جو پاکستانی عوام کا بالعموم اور پاکستانی طلبا کا بالخصوص علمی افق وسیع اور روشن کر دیں۔ "تشنہ" ان کا تخلص ہے، لیکن درحقیقت یہ ان کی فطرت کی ایک علامت بھی ہے، جو ظاہر کرتی ہے کہ علم کی بہت سی دولت حاصل کر لینے کے باوجود ان کی تشنگی قائم ہے۔

جناب نذیر احمد ۱۵ نومبر ۱۹۴۴ء کو آزاد کشمیر کے ایک قصبہ نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ سکول کے ابتدائی درجوں میں ہی انہیں کتاب سے محبت پیدا ہو گئی تھی اور جوں جوں عمر بڑھتی گئی ان کی یہ محبت بھی "روز افزوں" ہوتی گئی۔ انہوں نے میٹرک کا امتحان گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول بھمبر سے پاس کیا لیکن گھریلو حالات نامساعد تھے۔ چنانچہ مزید تعلیم کے لئے کالج میں داخلہ لینے کی

Marfat.com

بجائے انہوں نے محکمہ تعلیم میں ہی ملازمت اختیار کر لی۔گمان غالب یہ ہے کہ اس ملازمت کے دوران ہی انہیں احساس ہوا کہ ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے اور اب جو تشنگی پیدا ہوئی تو اس کو سیراب کرنے کے لئے انہوں نے علم کے دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔ ملازمت کے دوران ہی ادیب عالم پھر ادیب فاضل کیا۔ان دو امتحانوں میں کامیابی کے بعد ان کے لئے ایف اے اور بی اے کے دروازے کھل گئے۔نذیر احمد صاحب کی عادت عجیب تھی کہ ایک امتحان پاس کرنے کے بعد اگلا امتحان دینے کی تمنا پیدا ہو جاتی۔چنانچہ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی ایڈ' ایم اے اردو اور ایم اے تاریخ کے امتحانات پاس کئے اور کالج آف ایجوکیشن کراچی سے ایم ایڈ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ایم فل اقبال اوپن یونیورسٹی سے کر لیا۔تو دل میں پی ایچ ڈی کرنے کی لگن سما گئی۔انہوں نے جام شورو یونیورسٹی میں اپنی رجسٹریشن کرا رکھی تھی اور مجوزہ موضوع پر کثرت سے مطالعہ کر رہے تھے لیکن پیرانہ سالی آڑے آ گئی اور یہ ڈگری حاصل کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

نذیر احمد تشنہ کی تعلیمی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ زندگی بھی ان پر ہر دور میں مہربان ہوتی گئی اور محکمہ تعلیم میں کامیابیاں ان کے قدم چومتی چلی گئیں۔انہوں نے تدریس کا پیشہ سکول سے اختیار کیا تھا لیکن ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے تک پہنچ گئے اور گورنمنٹ بوائز ڈگری کالج بھمبر میں شعبۂ تاریخ کے صدر مقرر کئے گئے اور ملازمت کی معینہ عمر کو ۱۹۹۹ء میں پہنچے تو ریٹائر ہو گئے۔

نذیر احمد تشنہ کو تاریخ سے گہری دلچسپی ہے، انہوں نے ''تاریخ پاکستان'' سلاطین دہلی اور تاریخ کشمیر جیسی کتابیں لکھیں تو انہیں تاریخ کا فلسفہ دریافت کرنے میں بھی دلچسپی پیدا ہو گئی، اس موضوع پر ان کی کتاب ''فلسفۂ تاریخ'' چھپ چکی ہے' اسلام اور تاریخ اسلام سے

Marfat.com

وابستگی نے ان کو ''جدید دنیائے اسلام'' اور ''محمد رسول اللہؐ'' جیسی مقدس کتابیں لکھنے پر مائل کیا۔ ''تحریکات پاکستان'' تحریکات اردو'' کے ساتھ انہوں نے ''علم نفسیات'' پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ان کی عمر بھر کی وابستگی سکولوں اور کالجوں کے ساتھ تھی اور انہوں نے طلبا اور اساتذہ کی رہنمائی کو بھی کسی مرحلے پر نظر انداز نہیں کیا ''تدریس ادب'' ''تدریس مطالعہ پاکستان'' ''تدوین نصاب تعلیم' مطالعہ کشمیر' مطالعہ پاکستان' سبقی اشارات اور اردو ضرب الامثال ان کی چند رہنما کتابوں کے نام ہیں جن میں سے بیشتر مقبول اکیڈمی سے چھپ چکی ہیں۔

نذیر احمد تشنہ ایک کتاب دوست شخصیت ہیں۔لاہور آئیں تو کتابوں کی بڑی دکانوں پر ضرور چکر لگاتے ہیں اور انارکلی کے باہر پرانی کتابوں کی دکانیں کھنگالنے میں بھی بہت سا وقت صرف کرتے ہیں۔انہیں نایاب کتابوں کی تلاش ہر وقت رہتی ہے اور زیر تصنیف موضوع پر کوئی نایاب کتاب مل جائے تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ایک مرتبہ ایک کتاب ''ضرب الامثال'' پر لکھ رہے تھے اور ہر ضرب المثل کے لئے پس منظر کی کہانیوں کی تلاش میں تھے۔ان کی یہ کتاب مقبول اکیڈمی سے چھپ رہی تھی لیکن حالت یہ تھی کہ جب کوئی نئی کہانی کسی ضرب المثل کے بارے میں مل جاتی تو فوراً خط لکھ کر اضافہ کرا دیتے۔ایک دفعہ فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کے لمبی قطار میں حافظ محمود شیرانی کی مرتبہ کتاب ''سرمایۂ اردو'' نظر پڑی لیکن خریدنا بھول گئے۔بھمبر سے جاتے ہی خط لکھا کہ فلاں کباڑی سے یہ کتاب حاصل کر کے بھجوائیے۔

اقبال اوپن یونیورسٹی میں وہ پروفیسر نظیر صدیقی کے زیر سایہ ایم فل پر کام کر رہے تھے اس حوالے سے کبھی کبھی خود کو ''نظیر احمد تشنہ'' بھی لکھ دیتے تھے۔انشائیہ کا ذکر آیا تو ''وزیری'' اور ''نظیری'' کا تذکرہ ایک خط میں مزاح کے طور پر کیا لیکن وزیر آغا کو باکمال انشائیہ نگار تسلیم کیا اور نظیر صدیقی کے لئے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ دے۔اس سے ان کے ہاں

Marfat.com

مزاح کی لطیف حس کی موجودگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے.....

نذیر احمد تشنہ بے حد مخلص انسان ہیں' ان کا خلوص ان کے چہرے سے عیاں ہے' سر کے سفید بال اور تراشیدہ سفید داڑھی عمر ضعیفی کو ظاہر کرتی ہے لیکن جس رفتار سے انہوں نے کتابیں لکھی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ آتش ابھی جوان ہے جو دو معنوی اولادوں کے درمیان ''وقفے'' کو ضروری نہیں سمجھتا۔ آپ انہیں کثیر التصانیف نہیں کثیر الاولاد کہہ سکتے ہیں۔

Marfat.com

سید واجد رضوی

سید واجد رضوی پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن ان کی زندگی کا نصب العین دینِ اسلام کی اقدار اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فروغ تھا۔ اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے تبلیغ کا روایتی طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کے بند ذہنوں کے بند دروازوں پر دستک دینے اور ان کی عقل سلیم کو جگانے کیلئے تصنیف و تالیف کی طرف آ گئے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ہی انہوں نے تعلیمی اداروں کی سرپرستی اختیار کی اور اتحاد ملی کے لئے فلاحی ادارے قائم کئے اور ان کی آبیاری میں اپنی جائز آمدنی کا بیشتر حصہ صرف کر دیا اور نقصانِ مایہ کی پروانہ کی۔

سید واجد رضوی کا روئے سخن پاکستان کے اس اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کی طرف تھا جو مغرب کی گمراہیوں میں کھویا ہوا تھا' اس لئے انہوں نے تصنیف و تالیف کے لئے انگریزی زبان کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ عام لوگوں کے استفادہ کے لئے ان کتابوں کا ترجمہ بھی شائع کیا۔

سید واجد رضوی پہلی دفعہ لاہور تشریف لائے تو میں نے انہیں حکومت پاکستان کا کوئی بڑا افسر سمجھا۔ میں تعظیماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو وہ اس وقت تک کرسی پر نہیں بیٹھے جب تک کہ میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ نہیں گیا۔ چند رسمی باتوں کے بعد ہی وہ بولے۔ ''میں ایک نیک مقصد لے کر

Marfat.com

آپ کے پاس آیا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر میری کتابیں آپ کا ادارہ شائع کرے" سچی بات یہ ہے کہ افسانے اور ناول چھاپ چھاپ کر میرے دل میں بھی آرزو پیدا ہوگئی تھی کہ ادارے کے اشاعتی پروگرام میں مزید تبدیلیاں لائی جائیں۔ واجد رضوی صاحب کی اس تجویز سے پہلے بھی میں چند کتابیں دینی موضوعات پر چھاپ چکا تھا اور ان کی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ میں نے ان کی تجویز کو قبول کرنے میں ذرا سا تامل بھی نہ کیا بلکہ خوشی ہوئی کہ وہ تحریر کا کام صرف خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کر رہے تھے۔ سید صاحب دو کتابوں کے مسودے ساتھ لائے تھے۔ میں نے ان سے مسودے لے کر آنکھوں سے لگائے اور ذہن میں ان کی طباعت و اشاعت کا فوری پروگرام بنا لیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ دو کتابیں حضور نبیٔ آخر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور اپنی روح کی سرشاری کے لئے لکھی تھیں۔ اس لئے زمانہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور انہیں دو گولڈ میڈل پیش کئے۔

جناب واجد رضوی ۲۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قانون کی ڈگری عثمانیہ یونیورسٹی سے لی اور حیدر آباد دکن میں پریکٹس شروع کر دی۔ ذاتی مسائل اور مقدموں میں الجھے ہوئے انسانوں کے مطالعے سے ان کو احساس ہوا کہ ان کا معاشرہ سماجی ناہمواریوں کا شکار تھا۔ اور اس کی فلاح کے لئے دین اسلام کے سنہری اصولوں کی طرف راغب ہونے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران آزادی کی تحریک شروع ہوگئی تو انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی آواز پر لبیک کہا اور تحریک پاکستان کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن ہندوستانی سامراج نے پولیس ایکشن سے حیدر آباد کی آزادی ختم کر دی اور نواب حیدر آباد کی مدد برطانوی سرکار نے بھی نہ کی اور واجد رضوی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے اور ایبٹ آباد میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اسی دوران ہی انہوں نے سعودی عرب اور چین کی سیاحت بھی کی۔ ان کی سماجی سرگرمیوں کی شہرت اتنی پھیلی کہ چین کی حکومت نے ان کو اپنے مہمان کی حیثیت میں مدعو کیا۔

سید واجد رضوی کا مستقل پیشہ وکالت تھی۔ وہ بالعموم ایسے لوگوں کے الجھے ہوئے

Marfat.com

مقدمے لیتے تھے جن کو دوسرے وکلاء لینے کے لئے بھاری فیس کا تقاضا کرتے تھے رضوی صاحب مقدمے کی نوعیت کے ساتھ اپنے مؤکل کی سماجی و معاشرتی حالت کو بھی دیکھتے اور اکثر اوقات فیس لینے سے انکار کر دیتے۔ وہ اسے بھی سماجی خدمت شمار کرتے تھے۔ وکالت کے شعبے نے ہی انہیں سیاست کے اسرار و رموز بھی سکھائے اور انہوں نے کچھ عرصے تک تحریک استقلال میں سیکرٹری جنرل کی خدمات انجام دیں لیکن جب پاکستانی سیاست کا سیاہ چہرہ دیکھا تو دوسری سماجی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آپ نے ایبٹ آباد میں اتحاد ملی پاکستان، بزم علم و فن اور پاکستان روٹری کلب کے صدر اور زیلاف کلب کے نائب صدر کی خدمات انجام دیں۔ ایبٹ آباد کے خواص اور عوام سب ان کی بے لوث خدمات کی تعریف کرتے تھے۔ انہیں سیدہ ظہیر النساء ایجوکیشن ٹرسٹ کے بانی رکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے پان اسلامک ٹرسٹ میں بھی خدمات انجام دیں۔ خدمت خلق کا ایک اور ادارہ انہوں نے ''فری میڈیکل اینڈ لیگل ایڈ ٹرسٹ'' کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد نادار لوگوں کی خدمت تھا۔

سید واجد علی رضوی کی کم از کم ۱۵ کتابیں مقبول اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ ان میں ''رسولؐ میدان جنگ میں''.....زوالِ ملت و نشاۃ ثانیہ.....''احسن طرز حکمرانی'' ''پیغمبر رحمتؐ''، ''ذوق جہاد'' اور نظریۂ پاکستان کو قبول عوام حاصل ہوا۔ سید واجد علی رضوی کا مقصد انسانیت کی خدمت تھا۔ وہ اپنی کتابوں کی قیمت بہت کم رکھتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بہت سی کتابیں اہل ذوق کو بلا قیمت پیش کر دیتے۔ افسوس کہ یہ غنی مزاج اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ ایبٹ آباد کی فضائیں ان کی شخصیت کی خوشبو سے محروم ہو گئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ (آمین)

Marfat.com

ڈاکٹر وحید قریشی

ڈاکٹر وحید قریشی اردو زبان و ادب کے نامور محقق' ممتاز تنقید نگار' شاعر اور دانشور تھے۔ میں ان کا شمار ایسی ادبی شخصیات میں کرتا ہوں جن کا نام لیتے ہی گردن ادب سے جھک جاتی ہے اور جن کی مجالس میں بیٹھنے والوں کو ان کی باتیں سن کر ان کی اپنے ذہن پر روشنی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ انہیں استاد الاساتذہ تسلیم کیا جاتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے بھی اب خود اساتذہ کے درجے پر فائز ہیں اور علم کی دولت کو پھیلا رہے ہیں۔ میں یہاں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا' ڈاکٹر سہیل احمد خاں' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی' ڈاکٹر انور سدید' ڈاکٹر سعادت سعید اور ڈاکٹر زاہد منیر عامر کے چند نام گنوا سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی علمی اور ادبی شخصیت یہاں تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ اعلیٰ پائے کے منتظم بھی تھے۔ تاریخ نگاری ان کا شوق تھا اور فوٹو گرافی سے انہیں عشق تھا۔ میں جب کبھی ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو بھاری بھرکم وجود کے ساتھ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے اور بڑی محبت سے کبھی مصافحہ اور کبھی معانقہ کرتے۔ اردو بازار تشریف لاتے تو مقبول اکیڈمی پر بھی قدم رنجہ فرماتے اور انہیں دیکھ کر اکیڈمی میں موجود سب لوگ ان کی باتیں سننے لگتے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اردو ادب کا انسائیکلو پیڈیا تھے۔

Marfat.com

وحید قریشی کے والد محکمہ پولیس میں افسر تھے اور مختلف شہروں میں ان کے تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ وحید قریشی نے اپنا بچپن ننھیال میں گزارا اور ۱۹۴۰ء میں اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے میٹرک کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ چنانچہ انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا' ان کے اسی دور کے دوستوں میں جناب عنایت اللہ اور علامہ اقبال کے فرزندِ خورد جاوید اقبال تھے۔ وحید قریشی صاحب نے ایم اے تک تعلیم اس کالج میں حاصل کی اور اپنے ذوق کے مطابق ایک ایم اے فارسی میں اور دوسرا ایم اے تاریخ کے مضمون میں کیا۔ ان دونوں مضامین سے انہوں نے بعد میں اپنی زندگی میں ادبی فائدہ اٹھایا اور تحقیق وتنقید کا حق ادا کیا۔ وحید قریشی نے ۱۹۵۲ء میں فارسی ادب میں پی ایچ ڈی کی اور ۱۹۶۲ء میں اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ان کے مقالے کا عنوان میر حسن اور ان کا زمانہ تھا۔ وہ اکثر فخر کا اظہار کیا کرتے تھے کہ انہوں نے علامہ عباس شوستری ایرانی سے فارسی سبقاً سبقاً پڑھی تھی اور انہیں ریسرچ کے لئے ایلفرڈ سکالرشپ دیا گیا تھا جس کی اساس پر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تین سال تک خدمات بھی انجام دیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے تدریس کا شعبہ اپنے شوق کے مطابق اور مزاج کی مناسبت سے اختیار کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں تاریخ کے لیکچرار کی خدمات انجام دیں۔ پھر لاہور آ گئے اور اسلامیہ کالج کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں وہ اورینٹل کالج لاہور میں آ گئے جہاں انہوں نے مختلف عہدوں پر گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی نیم سرکاری اداروں میں خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے مقتدرہ قومی زبان' بزمِ اقبال اور اقبال اکیڈمی میں زبان اردو کے فروغ اور اقبالیات کے موضوعات کو منور کیا اور بہت سی کتابیں شائع کیں اور کئی ادبی رسائل کی ادارت کی جن میں مجلسِ ترقی ادب کا رسالہ ''صحیفہ'' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کا رسالہ ''اخبارِ اُردو'' بزمِ اقبال لاہور کا رسالہ ''اقبال'' اور اقبال اکیڈمی لاہور کا رسالہ ''اقبالیات'' کو بہت شہرت حاصل

Marfat.com

ہے۔زندگی کے آخری برسوں میں انہیں رسالہ ''مخزن'' کا مدیر بنایا گیا تھا جس کے حلقۂ مشاورت میں انہوں نے ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو شامل کر کے آگ اور پانی کا ملاپ کر دیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی خوبی یہ تھی کہ وہ خود ادبی امور میں متحرک رہتے تھے اور دوسروں کو ہمیشہ متحرک رکھتے تھے۔زندگی کے آخری چند برس انہوں نے بیماری کی حالت میں گزارے۔تکلیف اتنی زیادہ تھی کہ چلنا پھرنا موقوف ہو گیا لیکن بستر پر لیٹے لیٹے بھی وہ اپنے رابطے ٹیلی فون کے ذریعے قائم رکھتے تھے اور مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کے ناظم کی حیثیت میں ادارے کے تمام امور پوری تندہی سے انجام دیتے رہتے تھے۔میں خود پیشے کے لحاظ سے اشاعت وطباعت کے کام سے وابستہ ہوں لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ وہ اس شعبے کے تمام اسرار ورموز سے واقف تھے اور سرکاری سرمائے کو ذاتی سرمایہ سمجھ کر بڑی کفایت شعاری سے صرف کرتے اور اعلیٰ پائے کی علمی کتاب کم سے کم قیمت میں چھاپتے تھے ان کا مشن یہ تھا کہ اچھی ادبی کتاب زیادہ سے زیادہ پڑھنے والوں تک پہنچ جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو ابتدائی شہرت ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' لکھنے پر ملی تھی یہ کتاب بڑی متنازعہ ثابت ہوئی لیکن اس کی تردید میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ان کی تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔شاعری کے دو مجموعے ''نقدِ جان'' اور ''الواح'' چھپ چکے ہیں۔اپنی علالت کے دوران انہوں نے حالاتِ حاضرہ پر سینکڑوں قطعات لکھے۔فرماتے تھے کہ شاعری کرتے وقت مجھے اپنی بیماری بھول جاتی ہے۔''لیکن آخر ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو وفات پا گئے۔ حق تعالیٰ ان کو مغفرت فرمائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں شہزاد احمد نے لکھا ہے کہ جب وہ تنقید پر اتر آتے تو پھر امان ملنی مشکل ہو جاتی اور مرزا غالب کی طرح دوست کے کلام کو دشمن کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ان کی تحقیق وتنقید کے ساتھ شاعری اور مزاح نگاری کی تحقیق بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ انہیں جہاں موقع ملتا اپنا تاثر ایک چست فقرے سے یوں پیش کر دیتے کہ سننے والے قہقہہ

Marfat.com

بار ہو جاتے۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے بتایا کہ ڈاکٹر وحید قریشی ان لوگوں میں سے تھے جو جملہ ضائع نہیں کرتے' دوست ضائع کر دیتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ دوسروں کو جملہ کسنے کا موقع بھی دیتے اور ان کی اپنی ذات دوسروں کے جملے کی زد میں آ جاتی تو برا نہ مانتے اور کھل کر قہقہہ لگاتے۔ان کا قہقہہ ان کی پہچان تھی۔ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا ہے کہ تحقیق کا سخت چھلکا اتر جانے کے بعد اندر سے نرم اور ملائم شخص برآمد ہو جاتا..... ہدف متعین کئے بغیر فقرہ بازی سے چاند ماری ہوتی''۔

ڈاکٹر صاحب سے میں ان کی صرف تین کتابیں حاصل کر سکا۔ایک مضامین کا مجموعہ ''جدیدیت کی تلاش میں'' تھا۔دوسری کتاب کا نام ہے ''افسانوی ادب'' ہے اور تیسری کتاب کا نام ''پیش دستیاں'' ہے۔طنز و مزاح کی یہ کتاب زیر طبع ہے،ڈاکٹر وحید قریشی کی طبیعت عاجزانہ تھی لیکن ان کا مزاج حاکمانہ تھا۔جہاں برائی دیکھتے وہاں اس کے مقابلے پر اتر آتے۔لیکن غصہ اتر جاتا تو ابریشم کی طرح نرم ہو جاتے۔افسوس اب ہم ان کو نہ مل سکتے ہیں' نہ باتیں کر سکتے ہیں' نہ دیکھ سکتے ہیں۔

Marfat.com

ڈاکٹر وزیر آغا

میرے خیال میں ڈاکٹر وزیر آغا اردو کے واحد مصنف تھے جن کی شاعری اور تنقید کا سکہ ان کی زندگی میں پوری اردو دنیا میں چلتا رہا اور جن کے نظریات سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے ان کا انفرادی اعزاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو کی ایک ناموسوم صنف کو جس میں بات اپنی ذاتی پسند کے حوالے سے کی جاتی ہے ''انشائیہ'' کے نام سے موسوم کیا اور اس صنف میں ایسی اعلیٰ پائے کی تخلیق کاری کی کہ جناب مشتاق احمد یوسفی نے انہیں اس صنف ادب کا بانی قرار دے دیا اور ان کی کتاب ''چوری سے یاری تک'' کا پیش لفظ لکھا تو انہیں انشائیہ میں اس وقت تک کا منتہی بھی قرار دیا۔ چنانچہ یہ کہنا مناسب ہے کہ ایک صنف ادب جس کے جدید خدوخال وزیر آغا نے نکھارے ان کے نام سے وابستہ ہے اور انہوں نے رسالہ ''ادبی دنیا'' اور ''اوراق'' کے صفحات پر انشائیہ کی تحریک برپا کر دی جس کو اہل ادب نے قبول کیا اور اب انشائیہ لکھنے والوں کی متعدد کہکشائیں آباد ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا ۱۷ مئی ۱۹۲۲ء کو سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں وزیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آغا وسعت علی خان وسیع اراضی کے مالک تھے اور یہ اراضی نہری پانی سے

Marfat.com

کاشت ہوتی تھی لیکن ان پر اجناس پیدا کرنے کی بجائے صرف انگریزی سرکار کے لئے گھوڑوں کا چارہ پیدا کرنے کی پابندی تھی۔ چنانچہ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا نہیں ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم دیہات کے ٹاٹ مدرسوں میں حاصل کی، میٹرک گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے اور ایف اے جھنگ کالج سے پاس کیا۔ بی اے اور ایم اے میں ان کے موضوعات میں ''اکنامکس'' بھی شامل تھی۔ ان کے والد انہیں انگریزی سرکار کی فوج میں بھرتی کرانا چاہتے تھے لیکن آغا صاحب نے اس تجویز کو منظور نہ کیا۔ دراصل گورنمنٹ کالج لاہور کی کشادہ اور آزاد فضا نے انہیں سرکار کی نوکری اور غلامی سے متنفر کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کاشتکاری کو ترجیح دی جس کی انہیں دوسری جنگ عظیم کے بعد اجازت مل گئی تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کو ادبی ذوق اپنے والد آغا وسعت علی خان (جو ویدانت کی دنیا میں گیانی اور تصوف کی دنیا میں صوفی مشہور تھے۔ اور 'ع' 'خ' کہلاتے تھے) سے ورثے میں ملا تھا۔ آغا صاحب نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''شام کی منڈیر سے'' میں بیان کیا ہے کہ ان کے والد برگد کے ایک گھنے درخت کے نیچے کھاٹ بچھا کر بیٹھ جاتے اور انہیں زندگی کے حقیقی راز و اسرار تصوف کے زاویئے سے سکھاتے۔ اس عمل میں ان کے دوسرے ساتھی شمس آغا تھے جو بعد میں افسانہ نگار مشہور ہوئے اور ایک دن حق کی تلاش میں نکلے تو واپس نہ آئے۔ ان کے افسانوں کے مجموعہ ''اندھیرے کے جگنو'' چھپ چکا ہے۔

وزیر آغا اگرچہ شمس آغا کے ماموں تھے لیکن دونوں ہم عمر تھے' دونوں کو ادب کا شوق تھا۔ وزیر آغا نے کالج کے زمانے میں ہی انگریزی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ شمس آغا کے ساتھ ان کی بحث ادب اور زندگی کے موضوعات پر خوب چلتی۔ ادب کی اس آتش شوق کو ''ادبی دُنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین نے خوب بھڑکایا، اس دور میں انہوں نے اردو میں بھی نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں جو رسالہ ''ساقی'' میں نصرت آراء نصرت کے نام سے چھپتی تھیں۔ لیکن مولانا صلاح الدین احمد انہیں نثر کی طرف لے آئے اور انہوں نے ''ادبی دنیا'' میں مضامین کا

Marfat.com

ایک سلسلہ لکھا جو بعد میں کتاب ''مسرت کی تلاش'' میں جمع کر دیئے گئے۔مولانا نے انہیں ''ادبی دنیا'' کے دور پنجم میں اپنا معاون مدیر بنا لیا۔ان کی وفات کے بعد انہوں نے رسالہ ''اوراق'' جاری کیا۔رسالہ ''ادبی دنیا'' عبداللہ قریشی کی ادارت میں کامیاب نہ ہو سکا تو اسے بند کر دیا گیا۔اب وزیر آغا نے اپنے رسالہ ''اوراق'' کو مولانا صلاح الدین احمد کی یادگار بنا دیا۔اس عہد ساز پرچے نے جو جنوری ۱۹۶۶ء میں جاری ہوا تھا۔قریباً چالیس برس تک اردو ادب کی کی گراں قدر خدمت کی اور سینکڑوں نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا جو اب اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور تخلیقی ادب میں اپنا نام پیدا کر چکے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ وزیر آغا نے شاعری' انشائیہ نگاری اور تنقید کے علاوہ ادبی رسالہ ''اوراق'' کی ادارت کو ہمیشہ فوقیت دی لیکن انہوں نے اپنا رزق زمین کی کاشتکاری سے حاصل کیا۔نظم جدید کے شاعروں پر انہوں نے تجزیاتی وتنقیدی مضامین لکھے۔جو ان کی کتاب ''نظم جدید کی کروٹیں'' میں شامل ہیں۔ان کی معرکہ آراء کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کے کم و بیش بیس ایڈیشن ہندو پاک میں چھپ چکے ہیں۔وزیر آغا اردو ادب کے واحد ادیب تھے جنہیں سویڈن میں نوبل ایوارڈ کمیٹی کے سامنے لیکچر دینے کا اعزاز حاصل ہوا۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا نام نوبل انعام کے لئے بھی تجویز کیا جاتا رہا لیکن تیسری دنیا کا باسی اور بالخصوص پاکستانی ہونے کے ناطے ان کا نام ''شارٹ لسٹ'' کر دیا جاتا تھا جبکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کے چند مجموعے انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکے تھے اور ان پر انگریزی زبان کے شاعروں نے حوصلہ افزا آراء دی تھیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کی۔اس مقالے کے داخلی نگران ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے اور امتحانی جائزہ رشید احمد صدیقی نے لیا۔یہ مقالہ اب اسی موضوع پر بنیادی حوالے کی کتاب شمار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی تصنیفات کی تعداد انگلیوں پر گنی نہیں جا سکتی۔''شام اور سائے'' ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ تھا۔اس کے بعد ''دن کا زرد پہاڑ''.....''نردبان''.....''گھاس

Marfat.com

میں تتلیاں''.....''اک کتھا انوکھی''.....''یہ آواز کیا ہے''.....''عجب اک مسکراہٹ''.....''چنا ہم نے پہاڑی رستہ''.....''ہم آنکھیں ہیں''.....''دیکھ دھنک پھیل گئی''.....''چٹکی بھر روشنی''اور نظموں کی چند دیگر کتابیں شائع ہوئیں۔وزیر آغا نے غزل میں اپنا انوکھا رنگ پیدا کیا۔ان کی کلیاتِ غزل کا نام''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل''ہے۔

وزیر آغا اردو کے واحد ادیب تھے جنہوں نے اپنی سوانح حیات نظم میں''اک کتھا انوکھی''کے نام سے اور نثر میں''شام کی منڈیر سے''لکھی۔ان کے انشائیوں کے مجموعے.....''خیال پارے''.....''چوری سے یاری تک''.....''دوسرا کنارا''.....''سمندر اگر مرے اندر گرے''چھپ چکے ہیں اور ان کے انشائیوں کی کلیات''پگڈنڈی''کے نام سے دوسری مرتبہ شائع ہوئے۔

وزیر آغا کے ادب کی غالب جہت ان کی تنقید ہے۔اس جہت میں انہیں مولانا الطاف حسین حالی' امداد امام اثر اور محمد حسین آزاد کے بعد جدید اردو تنقید کا سب سے اہم نقاد تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کے نظریات کو سب سے زیادہ موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ان کے فن پر ڈاکٹر انور سدید نے''وزیر آغا ایک مطالعہ''کے نام سے اور رفیق سندیلوی نے''وزیر آغا فن اور شخصیت''کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ہندوستان اور پاکستان میں ان کے فکر وفن پر لکھے گئے تحقیقی مقالات پر ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دی جا چکی ہیں۔ان کی تنقید کی کتابوں میں''تنقید اور محاکمہ''،''نئے مقالات''،''تصوراتِ عشق وخرد اقبال کی نظر میں''''تنقید اور مجلسی تنقید''،''دائرے اور لکیریں''.....''ساختیات اور سائنس''''دستک اس دروازے پر''اور''معنی وتناظر''بہت اہم ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا بلاشبہ ایک فرد تھے لیکن ان کی حیثیت ایک انجمن کی تھی۔مجھے ان سے لاہور میں ان کے سرور روڈ والے گھر پر ملنے کا موقعہ متعدد مرتبہ حاصل ہوا۔میں جب کبھی انہیں ملنے کے لئے گیا تو انہیں ادیبوں کی محفل میں گھرا ہوا پایا۔ان کے دوستوں میں ان کی کتابیں بھی شامل ہیں۔وزیر آغا کا سماجی مرتبہ بہت بلند تھا۔حکومت پاکستان نے ان کی اعلیٰ خدمات کا

Marfat.com

اعتراف ''ستارۂ امتیاز'' پیش کر کے کیا۔لیکن مزاج کے اعتبار سے ان کے اندر ایک ''مہاتما بدھ'' بیٹھا ہوا تھا۔ جو دنیا پر حقارت کی نظر تو نہیں ڈالتا تھا لیکن ان کا دنیا کی طرف رغبت کا رجحان بھی نہیں تھا۔ میں نے انہیں اپنی سادہ سی خودنوشت سوانح ''سفر جاری ہے'' پیش کی تو انہوں نے اس پر محبت کی نظر ڈالی اور اس پر ایک حوصلہ افزا مضمون بھی لکھا۔

وزیر آغا بلاشبہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ تھے' ان کا کام سرسید' حالی اور آزاد کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا اور آنے والی نسلیں ان سے استفادہ کریں گی۔

۷ ستمبر ۲۰۱۰ء کی رات کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔اب ادب کی دنیا ویران نظر آتی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

آپ کی لائبریری کے لئے

خوبصورت کتابیں

پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ملک مقبول احمد

ارمغان غزل

ملک مقبول احمد

سفر جاری ہے

ملک مقبول احمد

گم شدہ افسانے

ملک مقبول احمد

پذیرائی

ملک مقبول احمد

گلشن ادب

ملک مقبول احمد

اہل قلم کے خطوط

ملک مقبول احمد

رہنمائے حج عمرہ

ملک مقبول احمد

Marfat.com

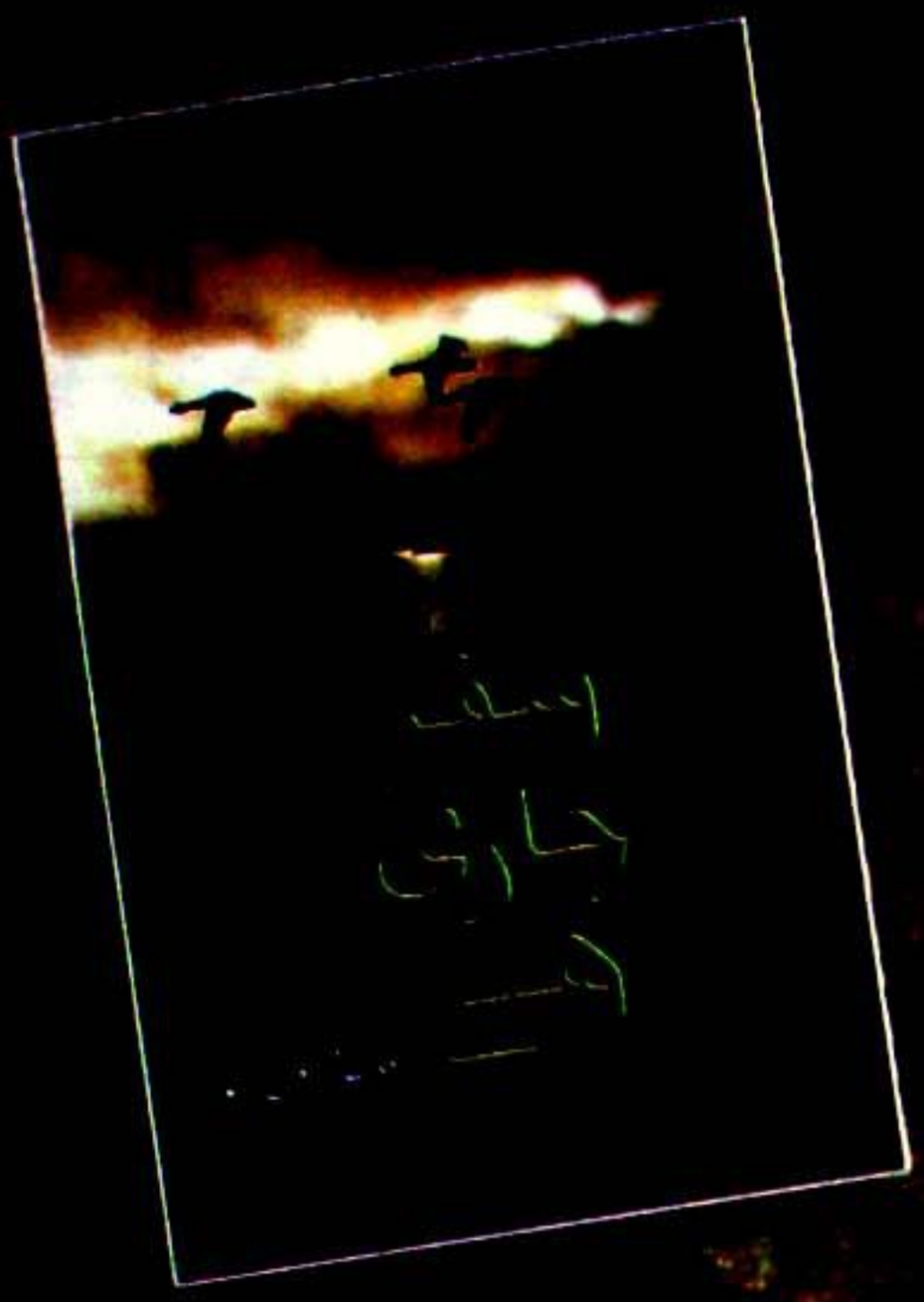

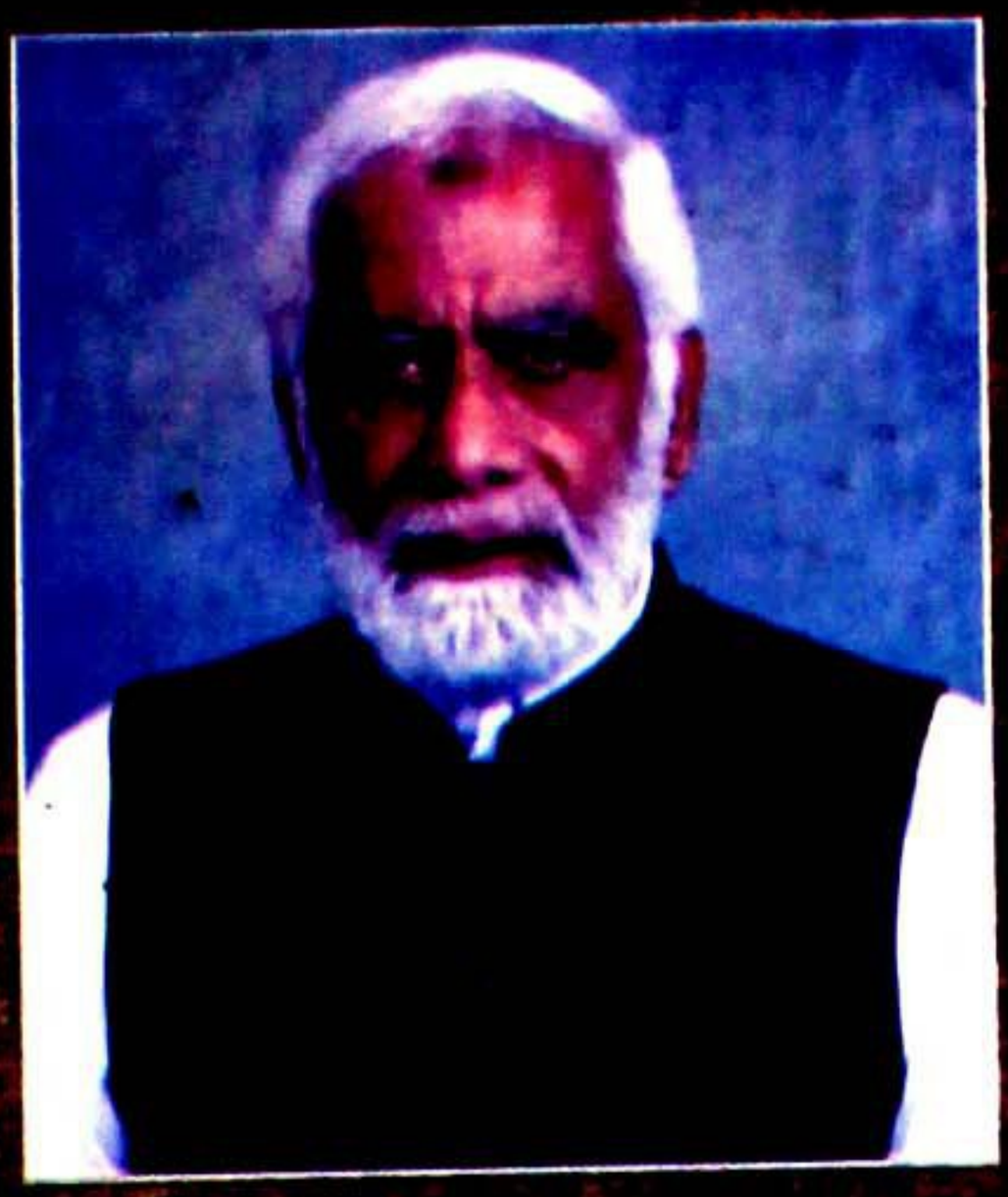

''پچاس نامور ادبی شخصیات'' ملک مقبول احمد کی شخصیت نگاری کا ایک خوبصورت نقش ہے، جس میں مصنفین کے حالاتِ حیات کا قیمتی اجمال بھی سما گیا ہے، جو طلبا کے لئے ان کے تحقیقی کاموں میں معاون ثابت ہوگا اور ادیبوں کی شخصیت کے بارے میں ملک صاحب کے ذاتی تاثر نے کردار نگاری کی صورت بھی اختیار کی ہے۔ میں اس کتاب کی تالیف پر ملک مقبول احمد کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بلاشبہ وہ تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنی عمر کی پختگی کے دور میں آئے ہیں لیکن کئی خرگوشوں سے آگے نکل گئے ہیں۔

ملک مقبول احمد کی تحریر میں جو شگفتگی، تازگی اور بے ساختہ پن ہے اس کی داد نہ دینا صریحاً ناانصافی ہوگی۔ ناشر کی حیثیت سے جن لوگوں سے انہیں واسطہ پڑا ہے، انہوں نے ان کی قلمی تصویریں ایک ماہر عکاس کی طرح پیش کر دی ہیں۔ اس قدر سلیس اور شستہ انداز میں یہ خاکے لکھے گئے ہیں کہ انہیں ادب پارے کہا جا سکتا ہے۔ خاکہ نویسی کے بعد اب ملک مقبول احمد کس صنفِ ادب پر توجہ دیں گے، اس کا جواب بہت جلد ہمارے اور آپ کے سامنے ہوگا۔ کیونکہ وہ ادیب بھی ہیں اور ناشر بھی۔ یعنی ''خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ''۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت، زندگی اور حوصلہ عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے اس ''دو دھاری'' قلمی جہاد کو جاری رکھیں۔

زیرِ نظر کتاب میں ادبی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے ملک مقبول احمد نے بالکل نیا اسلوب اور انوکھا طرزِ تحریر اختیار کیا ہے۔ اسے خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کا حسین امتزاج کہا جا سکتا ہے بہر حال یہ امر طے ہے کہ یہ کتاب حوالے اور ریفرنس کا کام دے گی اور ادب کے طلبا اس سے مستفید ہوں گے۔ ملک صاحب نے نہایت عرق ریزی، محنت، توجہ اور لگن کے ساتھ پچاس ادبا، شعرا اور اہلِ قلم کے بارے میں نہ صرف مستند معلومات جمع کر دی ہیں بلکہ ان جلیل القدر شخصیات کا دلکش اور دلآویز مرقع پیش کر دیا ہے۔

مقبول اکیڈمی، لاہور

Marfat.com